PDF Compressor Free Version

زبان و ادب

بہار اردو اکادمی کا ماہانہ مجلّہ

اکتوبر ۲۰۱۶ء

₹ : 15/-

PDF Compressor Free Version

پیغام آفاقی: تصویری یادگاریں

دائیں سے بائیں
جناب مشتاق احمد نوری
جناب مظفر امام قادری
اور
جناب پیغام آفاقی

دائیں سے بائیں
پروفیسر صغیر افراہیم
جناب مظفر امام قادری
جناب پیغام آفاقی
اور
جناب مشتاق احمد نوری

دائیں سے بائیں
اہلیہ جناب پیغام آفاقی محترمہ رضیہ سلطانہ
جناب پیغام آفاقی، جناب اسرار گاندھی
ڈاکٹر ثروت خان، محترمہ نثار عظیم
اور
پروفیسر علی احمد فاطمی

PDF Compressor Free Version

زبان و ادب

بہار اردو اکادمی کا ماہانہ مجلّہ

نائب صدور

جناب سلطان اختر

ڈاکٹر اعجاز علی ارشد

مدیر

مشتاق احمد نوری

سکریٹری، بہار اردو اکادمی

Mob. 09431080070

معاون مدیر

انوار محمد عظیم آبادی

جلد: ۳۷ شمارہ: ۱۰

اکتوبر ۲۰۱۶ء

زرتعاون : پندرہ روپے

سالانہ : ایک سو پچاس روپے

ترسیل زر اور خط و کتابت کا پتہ : سکریٹری بہار اردو اکادمی، اردو بھون، چوہٹہ، اشوک راج پتھ، پٹنہ ۸۰۰۰۰۴ (بہار)

''زبان و ادب'' میں شائع ہونے والی تحریروں میں ظاہر کی گئی مصنفین کی آرا سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں

email : zabanoadabbua@gmail.com
buapat2014@gmail.com

فیکس/فون: 0612-2678021 - 2301476

Web : www.biharurduacademy.org

کمپوزنگ : پروین اشرفی

تزئین : زیبا پروین

PDF Compressor Free Version

ترتیب

اداریہ	حرفِ آغاز	مدیر	۳
	خصوصی گوشہ : مطالعۂ پیغام آفاقی		
	''ٹوٹنے کے بعد'' کی کہانی	غضنفر	۵
	پیغام کا جانا	علی احمد فاطمی	۹
	وسیع کینوس کا فنکار: پیغام آفاقی	پروفیسر صغیر افراہیم	۱۰
	پیغام آفاقی: مقبول فکشن نگار	قیصر نذیر خاور	۱۵
	ایک عظیم انسان، ایک عظیم فنکار: پیغام آفاقی	ڈاکٹر قیام نیر	۱۶
	قطعہ تاریخ وفات پیغام آفاقی	پروفیسر عبدالمنان طرزی	۱۸
	ناول ''مکان'' کا تانیثی مطالعہ	رقیہ نبی	۲۰
	ناول ''پلیتہ'': ایک مطالعہ	نشاط اختر	۲۸
	ناول ''مکان'' کے چند اہم پہلو	عندلیب عمر	۳۲
	مکان: ایک جائزہ	حنا پروین	۳۴
	پیغام آفاقی بحیثیت افسانہ نگار	محمد فہام الدین	۳۷
	مہاشویتا دیوی: یادیں اور باتیں		
	مہاشویتا دیوی: حاشیے پر کھڑی زندگی کی ترجمان	ڈاکٹر مشتاق احمد	۳۹
	مہاشویتا دیوی سے ایک گفتگو	شبیر احمد	۴۲
افسانے	سایہ فگن دھوپ	ڈاکٹر اسلم جمشید پوری	۴۸
	بی بانو اور زوئی ڈارلنگ	فارحہ ارشد	۵۱
	سناٹا	نشاط پروین	۵۴
منظومات	مٹی بدن نظمیں (تم میرا خمار ہو یا سرور زندگی، ریت، گھروندا)	خورشید حیات	۵۷
	تعبیر خواب کی	نوشاد مومن	۵۹
	غزلیں	ارمان نجمی	۶۰
	غزلیں	پروفیسر شاداب رضی	۶۱
	غزلیں	جمال اویسی	۶۲
	غزلیں	عمران راقم	۶۳
	غزلیں	ابونصر فاروق صارم	۶۴
کتابوں کی دنیا	گرداب (ناول) — شموئل احمد	مبصر: قنبر علی	۶۵
	دھند (افسانوی مجموعہ) — ڈاکٹر قیام نیر	مبصر: محسن رضا رضوی	۶۷
ہماری سرگرمیاں	اکادمی مجلس عاملہ کی اعلیٰ سطحی نشست میں اہم فیصلے		۶۸
سلام و پیام	کمال جعفری، جمال اویسی، اقبال مجیداللہ، ڈاکٹر ذکی ہاشمی، قیصر زاہدی، معین الدین عثمانی، فضل حسنین، احمد رشید، اقبال احمد، منظر عالم، عبدالباری، ظفر اقبال ظفر۔		۶۹

بچوں کا زبان وادب

۷۳ — ۸۰

PDF Compressor Free Version

اداریہ

حرف آغاز

آخرکار پیغام آفاقی بھی اپنے مکان میں جا سوئے۔

موت وحیات اللہ کی قدرت میں ہے۔ وہ جب کسی سے بہت زیادہ پیار کرنے لگتا ہے تو پھر اسے اپنے پاس بلا لیتا ہے، یہی وجہ ہے کہ کسی کی موت پر ہماری زبان سے بیساختہ یہ جملہ ادا ہو جاتا ہے کہ: ''وہ اللہ کو پیارا ہو گیا۔''

پیغام آفاقی بھی ہم سے بچھڑ گئے۔ وہ ایک عرصہ سے گلے کے کینسر میں مبتلا تھے، لیکن انہوں نے کبھی بھی ہمت نہیں ہاری۔ ان کے چہرے پہ نہ تو موت کا سایہ جھلکا، نہ ہی ان کی جبیں موت کے ڈر سے شکن آلود ہوئی۔ انہوں نے جس طرح زندگی چاہا گزارا، جو چاہا لکھا، لیکن انہوں نے اپنے اوپر کسی بھی دباؤ کو حاوی نہیں ہونے دیا۔ وہ سیوان ضلع کے رہنے والے تھے، انہوں نے علی گڑھ یونیورسٹی سے تعلیم حاصل کی، پھر انڈین پولیس سروس میں آئے۔

پیغام آفاقی کا نام اختر علی فاروقی تھا، لیکن ادبی دنیا میں وہ پیغام آفاقی کے نام سے جانے جاتے تھے۔ ۱۰ر جنوری ۱۹۵۶ء کو وہ عالم وجود میں آئے اور ۲۰، اگست ۲۰۱۶ء کو راہی عدم ہوئے اور ان کی تدفین ۲۱، اگست کو آبائی وطن چاپ (سیوان) کے قبرستان میں ہوئی۔

پیغام آفاقی ایک شخصیت کا نام نہیں تھا، بلکہ یہ ایک حوصلہ کا نام تھا۔ انہوں نے مرتے مرتے زندگی ہاری، حوصلہ نہیں ہارا۔ گلے کے کینسر کی وجہ سے آخری دنوں میں ان کے لئے بولنا مشکل تھا، لیکن ان کے لئے مسکرانا بہت آسان تھا۔ ۲۰۱۵ء میں ان سے میری پہلی ملاقات اودے پور کے انٹرنیشنل لٹریچر فیسٹول میں ہوئی تھی، جہاں وہ بہت ہی خندہ پیشانی سے ملے، اگرچہ اس سے قبل فیس بک کے کہانی فورم پر کچھ وجوہات کی بنا پر ان سے میری تلخ کلامی ہو چکی تھی، لیکن اپنی ملاقات کے دوران ان کے چہرے پہ ذرہ برابر بھی اس واقعہ کا کوئی اثر نہیں تھا۔ وہ مجھ سے یوں ملے، جیسے میری ان سے بہت قدیم کی شناسائی رہی ہو۔ وہ جس محفل میں بھی ہوتے اپنی بذلہ سنجی اور حاضر جوابی کی وجہ سے محفل کی جان بن جاتے۔ میں نے ان کی شخصیت میں اختر علی فاروقی کو بہت تلاش کرنے کی کوشش کی،

مگر ڈنڈے والے پولیس آفیسر کی کرخت شخصیت، پیغام آفاقی میں یوں مل گئی تھی جیسے دودھ میں شکر مل جاتا ہے۔ کبھی کبھی میں یہ سوچنے لگتا کہ اتنی مہربان شخصیت مجرموں پر کیسے اپنی کرخت چھاپ چھوڑ پاتی ہوگی۔ وہ دوستوں کی بہت قدر کرتے تھے، بہت محبت سے ملتے تھے، لیکن دشمنوں کے ساتھ بھی ان کا رویہ اتنا مشفقانہ ہوتا کہ لوگوں کو ان سے دشمنی پر پچھتانا پڑتا۔

پیغام آفاقی ادبی دنیا میں بہت متحرک رہے، لیکن ادب کے لئے انہوں نے بہت بڑا سرمایہ نہیں چھوڑا۔ ۱۹۷۹ء میں جب ان کا ناول ''مکان'' شائع ہوا تو وہ اپنے موضوع کے اعتبار سے، اپنے آپ میں ایک نرالا ناول تھا، جسے لوگوں نے ہاتھوں ہاتھ لیا اور پیغام آفاقی کے ساتھ ان کے ناول کی ہیروئن نیرا کو بھی کافی مقبولیت ملی۔ اس ناول میں پولیس والے کے داؤ پیچ کو جس مہارت سے پیغام آفاقی نے پیش کیا ہے، وہ انہیں کا حصہ ہے۔ پیغام نے اردو ناول کو نیرا کی شکل میں ایک بہت مضبوط نسوانی کردار دیا ہے، جیسے پیغام کی طرح بھلا دینا آسان نہیں ہوگا۔

پیغام آفاقی کا دوسرا ناول ''پلیتہ'' ۲۰۱۱ء میں منظر عام پر آیا۔ چھ سو صفحات پر مشتمل اس ناول کا انتساب پیغام نے ''بارودی سرنگوں کے نام'' کیا ہے۔ انتساب سے ہی ناول کے موضوع کا پتہ لگایا جا سکتا ہے۔ اس ناول کے موضوع کا کینوس بہت ہی وسیع ہے اور یہ ناول زمانی و مکانی تعینات سے

PDF Compressor Free Version

مادرا ہے۔کالا پانی کو محور بنا کر بہت سے ناول تحریر کئے گئے،لیکن کالا پانی اس ناول میں جس طرح جبر کا استعارہ بن کے ابھرا،وہ کیفیت کسی اور ناول میں دیکھنے کو نہیں ملتی ہے۔جس طرح ناول ''مکان'' میں انہوں نے بہت ریسرچ کیا اور ایک لمبے عرصے کے بعد وہ صفحہ قرطاس پر ابھرا،اسی طرح ''پلیتہ'' بھی ان کی ایک لمبے عرصے تک ادبی جدوجہد کا نتیجہ ہے۔پیغام کے فکر وفن اور ان کی ادبی کدوکاوش کی آنے والے دنوں میں لوگ پیمائش کریں گے،لیکن میں بس اتنا کہتا چلوں کہ پیغام نے جو بھی مختصر ادبی سرمایہ چھوڑا ہے وہ انہیں زندہ رکھنے کے لئے کافی ہوگا۔

پیغام آفاقی کو ان کی مجموعی خدمات کے لئے بہار اردو اکادمی نے اکیاون ہزار کے ''سہیل عظیم آبادی فکشن ایوارڈ'' سے ۲۰۱۵ء میں نوازا تھا۔ہم نے ایک مختصر گوشہ ان کے لئے مختص کیا ہے جسے آپ ہمارا خراج عقیدت بھی کہہ سکتے ہیں۔غضنفر،پیغام آفاقی کے دوست رہے ہیں،انہوں نے ان کے تیسرے ناول ''ٹوٹنے کے بعد'' کا ذکر کیا ہے اور پیغام آفاقی کی شخصیت پر بھی روشنی ڈالنے کی کاوش کی ہے،اسی طرح پروفیسر صغیر افراہیم نے بھی پیغام آفاقی کو وسیع کینوس کا فن کار کہا ہے اور ان کے فن پر بھرپور گفتگو کی ہے۔ڈاکٹر قیام نیر کے علاوہ دیگر قلم کاروں نے بھی پیغام آفاقی کے مختلف ناولوں اور افسانوں کا جائزہ پیش کیا ہے،جس سے ان کے فن پر بھرپور روشنی پڑتی ہے۔ہمیں امید ہے کہ ہماری یہ مختصر کاوش قارئین سے پسندیدگی کی سند حاصل کرنے میں کامیابی ہوگی۔

مہاشویتا دیوی کا ہندوستانی ادب کی اُن اولین خواتین میں شمار ہوتا ہے جنہوں نے قبائلی زندگی،ان کے درد،ان کے اندرونی خلفشار اور ان پر ہورہے مظالم کو اپنی تخلیقات کا حصہ بنایا۔انہوں نے قبائیلوں کے درمیان رہ کر ان کی زندگی اور ان کے مسائل کو قریب سے جانا،جھارکھنڈ،مغربی بنگال، مدھیہ پردیش کے جنگلوں کی انہوں نے خاک چھانی،منڈا،پہاڑی،سنتھال اور دیگر قبائلی طبقے کے مسائل کا بہت قریب سے مشاہدہ کیا اور اسے بعد میں انہوں نے اپنی تخلیق کا حصہ بنایا۔

۱۴جنوری ۱۹۲۶ء کو وہ ڈھاکہ میں پیدا ہوئیں جو اس زمانے میں ہندوستان کا حصہ تھا۔شانتی نکیتن میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد انہوں نے کلکتہ یونیورسٹی سے انگریزی ادب میں ایم۔اے کیا اور ۱۹۶۴ء میں انگریزی لکچرر کی حیثیت سے انہوں نے اپنی عملی زندگی شروع کی۔۱۹۸۴ء تک وہ درس و تدریس سے وابستہ رہیں۔ان کی ازدواجی زندگی خوشگوار نہیں رہی۔ہمیشہ نشیب وفراز کا سامنا ہوتا رہا،لیکن انہوں نے اپنے آپ کو کبھی بکھرنے نہیں دیا۔ان کا پہلا ناول ۱۹۵۶ء میں ''جھانسی کی رانی'' کے نام سے شائع ہوا تو بنگلہ ادب میں اس کا کافی چرچا ہوا۔اس ناول کا مواد انہوں نے گوالیار اور جھانسی کے دشوار گزار علاقوں میں گھوم گھوم کر جمع کیا تھا۔۱۹۵۷ء میں جب ان کا ناول ''ناٹی'' منظر عام پہ آیا تو بنگلہ ادب میں ایک ہلچل سی مچ گئی۔اس کے بعد ان کے ناول ''اگنی گربھ''،''ہزار چوراسی کی ماں''،''جنگل کے دعویدار''،''اینٹ کے اوپر اینٹ''،''عمر قید''،''جکڑن''،''ماسٹر صاحب'' وغیرہ جب منظر عام پر آئے تو لوگوں نے یہ محسوس کیا کہ وہ اپنی تخلیقات کے ذریعہ پسماندہ،دلت اور محروم طبقے بالخصوص قبائیلوں کی زندگی کے حقائق کو پیش کرنا چاہتی ہیں۔ان کا ناول ''رودالی'' بھی قبائلی طبقے کی زندگی کی اذیت ناک سچائیوں سے روشناس کراتا ہے۔اردو کی بدنصیبی ہے کہ ان کے ناول اردو میں ترجمہ نہیں ہو سکے۔ بہار اردو اکادمی کی کوشش ہوگی کہ ہم ان کے کچھ مشہور ناولوں کا ترجمہ اردو میں پیش کرسکیں۔مہاشویتا دیوی پر ڈاکٹر مشتاق احمد کا ایک مضمون اور شبیر احمد کا ان سے لیا گیا ایک انٹرویو ہم پیش کررہے ہیں جس سے ان کے فن اور شخصیت پر اچھی خاصی روشنی پڑنے کا امکان ہے۔

شمارے کے دوسرے مشمولات بھی امید کامل ہے کہ آپ کو اپنی طرف متوجہ کرنے میں کامیاب ہوں گے۔

PDF Compressor Free Version

غضنفر

T.T.I Building, Maulana Mohammad Ali Johar Marg,
Jamia Millia Islamia, New Delhi 110025

خصوصی گوشہ

مطالعۂ پیغام آفاقی

''ٹوٹنے کے بعد'' کی کہانی

''.....تم کو یہ جان کر خوشی ہوگی کہ میرا تازہ ناول 'ٹوٹنے کے بعد' جو تقریباً تین سو صفحات کا ہے، ابھی مکمل ہوا ہے۔ یہ ناول دلی کی زندگی کو ایسے بے نقاب کرتا ہے جیسے قصائی بکرے کو اور میں مطمئن ہوں کہ جن فنی تمازتوں اور پختگی کے ساتھ ناول لکھنے کے لیے میں نے تقریباً دس سال تک خموشی کی اذیت برداشت کی، انھیں تمازتوں اور پختگی کے ساتھ یہ ناول لکھا ہے۔ تمھیں یہ جان کر تعجب ہوگا کہ دس سال بعد جو یہ بندھ ٹوٹا ہے تو ماضی اپنے سارے قرضوں کے ساتھ میرے سامنے حاضر ہوگیا ہے۔ شاید تم یہ بات پسند نہ کرو، لیکن یہ بھی ایک عجیب حقیقت ہے کہ صرف یہی نہیں بلکہ پانچ سات ناول جڑواں بچوں کی طرح طویل بانجھ پن کے بعد ایک ہی ساتھ سر اٹھا رہے ہیں۔ میں نے اپنے اندر ایسے انقلاب کی کبھی امید نہ کی تھی۔ جیسے سوکھے کے بعد ہر سال برسات واپس آتی ہے ویسے ان دس سالوں کے بعد وہی آوارگی، وہی روانی، وہی تخیل کی آزادی اور پرواز، سب واپس آگئے ہیں، اس طرح کہ مجھے حیرت ہوتی ہے۔ ان ساری باتوں سے میرا صرف ایک ہی یقین پختہ ہوا ہے کہ انسان جو کچھ چاہتا ہے، قدرت عطا کرتی ہے۔ مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ مجھے ڈھکیل ڈھکیل کر ناول لکھوایا جا رہا ہے۔ اب میرا قلم ہے، قلم کی رفتار ہے اور سامنے کھڑے دیو پیکر ناول ہیں جنھیں لکھنا ہے۔ ناولوں کے خیالات جن کو جن کو سنائے، چاہے وہ مجتبیٰ فاروقی ہوں، شہریار ہوں، قاضی عبدالستار ہوں، جوگیندر پال ہوں یا نوجوان طبقہ ہو، یا وہ لوگ جنھیں ادب وغیرہ سے کوئی خاص تعلق نہیں، سب انگشت بدنداں رہ جاتے ہیں۔ تم نے چونچ مار مار کر، چونچ مار مار کر آخر آخر میرا خموشی کا گھڑا پھوڑ ہی ڈالا۔''

یہ اقتباس پیغام آفاقی کے ایک خط سے ماخوذ ہے جسے پیغام نے ۱۲ ستمبر ۱۹۸۷ء کو دہلی سے مجھے لکھا تھا، جب میں ''سولن اردو ٹیچنگ سینٹر سولن ہماچل پردیش'' میں جونیر ریسرچ کے عہدے پر کام کر رہا تھا۔ آپ سوچ رہے ہوں گے کہ اس خط کو لکھے ہوئے تقریباً اٹھائیس سال کا عرصہ گزر گیا، مگر ناول ''ٹوٹنے کے بعد'' تو نظر آیا نہیں۔ پیغام آفاقی کے تو صرف دو ہی ناول دکھائی دیتے ہیں: ''مکان'' اور ''پلیتہ''۔

آپ بالکل صحیح سوچ رہے ہیں۔ ابھی تک ان کے یہی دو ناول شائع ہوئے ہیں، مگر پیغام نے اپنے جس ناول کی تکمیلیت کا ذکر اپنے خط میں کیا ہے وہ ناول انھیں دونوں میں موجود ہے۔ دراصل ''ٹوٹنے کے بعد'' وہی ناول ہے جو مکان کے نام سے شائع ہوا۔ ''ٹوٹنے کے بعد'' اس کا نام اس لیے رکھا گیا تھا کہ اس میں وہی سب کچھ دکھایا گیا ہے جو ٹوٹنے کے بعد ہوتا ہے۔ یہ ٹوٹنا کسی مکان، دکان یا بے جان چیز کا ٹوٹنا نہیں ہے بلکہ انسان کا ٹوٹنا ہے جو ٹوٹ کر اور مربوط ہوتا ہے۔ مسلسل ضرب سے جس کی تخلیقیت جاگتی ہے اور جب تخلیقیت جاگتی ہے تو بہتوں کو سلا کر دم لیتی ہے۔ تخلیقیت کس طرح جاگتی ہے اور جب جاگتی ہے تو کیا کیا کرتی ہے، اس پر تفصیلی گفتگو سے قبل اس خط کے کچھ اہم جملوں کی وضاحت ضروری معلوم ہوتا ہے:

''تم نے چونچ مار مار کر آخر آخر میرا خموشی کا گھڑا پھوڑ ہی ڈالا۔''

PDF Compressor Free Version

اس جملے کا پس منظر یہ ہے کہ بے پناہ تخلیقیت اور اپنے تخلیقی جوہر کے کچھ نمونے پیش کرنے کے بعد پیغام اچانک خاموش ہو گئے اور یہ خموشی کوئی دس بیس دن یا دو چار مہینوں کی خموشی نہیں بلکہ دس سالوں پر پھیلی ہوئی ایک طویل خموشی ہے جس کی اذیت کا احساس خود پیغام آفاقی کو بھی ہے، جیسا کہ اس اقتباس سے بھی ظاہر ہے۔

پیغام کی چپی کی ضرب سب سے زیادہ میرے دل پر پڑتی تھی، اس لیے کہ میں پیغام کے اندر ایک بڑے تخلیق کار کو دیکھ چکا تھا اور میں چاہتا تھا کہ وہ تخلیق کار جلد سے جلد باہر آ جائے۔ مجھے اس بات کا خوف تھا کہ پیغام جس شاندار کیریئر کے پرسکون اور گھنے سائے میں چلے گیا تھا، وہاں کہیں اس کے اندر کا اضطراب ختم نہ ہو جائے اور فن کار اپنی فنکاری دکھائے بنا ہی غائب ہو جائے۔ میں نے اپنے اس خدشے کا اظہار اپنے ناول ''فسوں'' میں تفصیل سے کیا ہے۔ ناول ''فسوں'' میں عشام کا کردار دراصل پیغام کا کردار ہے جو افسانوی لبادے میں نظر آتا ہے۔ پیغام کے اندر کا تخلیق کار کہیں ہمیشہ کے لیے سو نہ جائے، اس لیے میں خط بھیج کر لفظوں کی کنکریاں اس پر مارتا رہتا تھا جسے پیغام نے اپنی زبان میں کوے کی چونچ اور گھڑے کی تمثیل والے اشارے سے ظاہر کیا ہے۔ اس خط کا دوسرا اہم جملہ ہے:

''ان ساری باتوں سے میرا صرف ایک ہی یقین پختہ ہوا ہے کہ انسان جو کچھ چاہتا ہے، قدرت عطا کرتی ہے۔''

اس جملے میں پیغام کی پوری شخصیت سمٹ آئی ہے۔ پیغام کی چاہت میں بے پناہ شدت ہوتی تھی۔ وہ یہ جانتا تھا کہ صرف چاہت کافی نہیں ہوتی بلکہ اس چاہت میں شدت ضروری ہے، اس لیے کہ شدت چاہت کو متحرک کرتی ہے، اسے حرکت میں لاتی ہے اور اس متحرک اور متشدد چاہت کی مسلسل دستک قدرت کو اپنی بخشش کے در کھول دینے پر مجبور کر دیتی ہے۔

پیغام کی چاہتیں ایسی ہی ہوتی تھیں۔ اس نے چاہا کہ وہ آئی۔ ایس آفیسر بن جائے سو، وہ آئی۔ پی۔ ایس بن گیا، اس نے چاہا کہ وہ سیریل کا ڈائریکٹر ہو جائے سو، وہ ایک سیریل ڈائریکٹر ہو گیا۔ اس نے چاہا کہ ایکٹنگ کرے سو، اس نے ایک سیریل میں ایکٹنگ بھی کی۔ اس نے چاہا کہ اپنے شہر سیوان میں ایک نئے انداز کا کالج کھولے، سو سیوان میں اس کے ہاتھوں ایک جدید طرز کا کالج کھل گیا۔ اگر زندگی وفا کرتی تو اس کی وہ چاہتیں بھی جو ناول کی شکل میں اس کے اندر کلبلا رہی تھیں یقیناً پوری ہو کر رہتیں۔ ویسے جاتے جاتے وہ ''مکان'' اور ''پلیتہ'' کے بعد اپنا تیسرا ناول بھی مکمل کر گیا جو کمپوزڈ شکل میں موجود ہے اور کتابی صورت میں ''دوست'' کے عنوان سے آنا ہی چاہتا ہے۔

پیغام اور میری دوستی کا ایک اہم نکتہ اشتراک یہ بھی تھا کہ ہم دونوں کی سوچ ایک دوسرے سے بہت حد تک ملتی تھی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ پیغام کی سوچ کافی منظم ہوتی تھی اور اپنے اظہار کے لیے تفصیل چاہتی تھی جب کہ میری سوچ کم منظم ہوتی تھی اور اختصار میں ظاہر ہوتی تھی۔ ہماری ایک جیسی سوچ کا اندازہ اس کے ناول ''مکان'' کے مرکزی خیال اور میرے اس شعر کے مفہوم سے لگایا جا سکتا ہے ۔

ہم کہ مربوط ہوئے اور شکستہ ہو کر
ٹوٹ کر کیسے بھلا لوگ بکھرتے ہوں گے

ان جملوں کی صراحت کے بعد آیئے اب آپ کو ناول ''مکان'' کی طرف لے چلوں جس میں ٹوٹنے کے بعد کی کہانی کہی گئی ہے:

''تہہ دار تخلیق کی ایک پہچان یہ ہوتی ہے کہ وہ آسانی سے تفہیم کی گرفت میں نہیں آتی، اس کے باوجود اپنے حسن اور معنویت کا احساس دلا دیتی ہے۔ اس کے اندر کا تجربہ اپنے رگ و ریشے میں معنی کی اتنی جہتیں سموئے ہوئے ہوتا ہے کہ دیکھنے والوں کو وہ مختلف روپ اور الگ الگ رنگ میں دکھائی دیتا ہے۔ کبھی کبھی تو ایک ہی نگاہ جب اس طرف دوبارہ دیکھتی ہے تو اس کی شکل بدل جاتی ہے۔''

ایسا ہی کچھ پیغام آفاقی کے ناول ''مکان'' کے مطالعے کے وقت ہوتا ہے۔ آفاقی کا ''مکان'' ایک ہوتے ہوئے بھی ایک نظر نہیں آتا۔ یہ الگ الگ نگاہوں کو الگ الگ شکلوں میں دکھائی دیتا ہے۔ کسی کو یہ ایک بیوہ عورت اور ایک یتیم بے سہارا بچی کا مکان دکھائی دیتا ہے جسے ایک کرایے دار اپنے حربوں اور ہتھکنڈوں سے ہڑپ لینا چاہتا ہے اور وہ بے سہارا لڑکی اتنے بڑے، بھرے پرے اور مضبوط سماج کی موجودگی میں،

PDF Compressor Free Version

جس میں عدالت بھی ہے اور پولیس بھی، جس کے پاس قانون بھی ہے اور انصاف بھی، کچھ نہیں کر پاتی۔

کسی کو یہ مکان انسانی پناہ گاہ اور تحفظ کی علامت نظر آتا ہے تو کوئی اسے غیر محفوظیت کے نشان کا نام دیتا ہے۔ کسی کو اس میں انسانوں کے استحصال کا عکس دِکھائی دیتا ہے اور کسی کو سماج کے جبر کا گھناؤنا منظر نظر آتا ہے۔ کوئی اس ناول کو عرفانِ ذات کی کہانی کہتا ہے تو کوئی اسے ذات کے عرفان کا عرفان سمجھتا ہے۔

مجھے بھی یہ ''مکان'' مختلف اوقات میں مختلف نظر آیا۔ پہلی بار جب میں نے اسے دیکھا تو یہ دنیا کی علامت نظر آیا تھا۔ دُنیا جہاں انسان نہ صرف یہ کہ پناہ لیتا ہے اور اپنے کو محفوظ رکھتا ہے بلکہ اپنی نشو و نما بھی کرتا ہے اور اپنی شخصیت کا ارتقا بھی۔ یہ ''مکان'' جس دنیا کی علامت ہے اس میں کچھ ایسی طاقتیں بھی ہوتی ہیں جو مکان سے لوگوں کو بے دخل کر کے اسے اپنے لیے محفوظ کر لینا چاہتی ہیں تا کہ وہ اسے اپنے لیے عیاشی کا اڈہ بنا سکیں اور جو بھی ان طاقتوں کے راستے میں آتا ہے اسے وہ یا تو کچل ڈالتی ہیں یا اگر اسے مضبوط پاتی ہیں تو کیبرے کی میگنیٹ میں جکڑ کر رکھ لیتی ہیں۔

ایسی دنیا میں کچھ ایسی قوتیں بھی ہوتی ہیں جو اس دنیا کے تحفظ اور انسانی بقا کے لیے وجود میں آتی ہیں جنھیں ہم نظامِ حیات کا نام دیتے ہیں، لیکن وہ بھی بشری طاقتوں کے دباؤ یا ان کے دِکھائے گئے منظروں اور تماشوں کے لالچ میں آ کر اپنے فرض کو بھول جاتی ہیں اور انھیں اپنے وجود تک کا احساس نہیں رہتا۔ پولس اور عدالت ان کی واضح مثالیں ہیں اور اس طرح یہ ''مکان'' دنیا کا آئینہ بن جاتا ہے۔

دوسری بار ''مکان'' مجھے انسانی تخلیقیت یا انسان کی تخلیقی قوت کی کہانی محسوس ہوا۔ ''مکان'' کا خالق انسان کے اندر پوشیدہ اس تخلیقی قوت کو متشکل کرنا چاہتا ہے جس کا ادراک ہوتے ہی جسم بے معنی ہو جاتا ہے اور جسمانی طور پر کمزور سے کمزور انسان بھی قوت کے زور پر اپنے اردگرد کے گھیروں کو توڑتا اور رکاوٹوں کو روندتا چلا جاتا ہے، اونچے اونچے پہاڑ گرنے اور بکھرنے لگتے ہیں، خلیجیں پٹنے لگتی ہیں، نشیب و فراز ہموار ہونے لگتے ہیں اور جو انسان اپنی تخلیقیت کو پا لیتا ہے وہ اس ناول کی ہیروئن نیرا کی طرح پر پیچ راستوں، اُونچے اُونچے پہاڑوں، گہری گہری گھاٹیوں، خوفناک موڑوں اور ٹیڑھی میڑھی اور تنگ سڑکوں سے ڈرنے کے بجائے ان سے کھیلنے لگتا ہے۔ ان میں اسے مزا آنے لگتا ہے اور اسے بھی ویسا ہی محسوس ہونے لگتا ہے جیسا کہ شملہ کی پہاڑیوں پر چڑھتے ہوئے نیرا کو محسوس ہوا:

> ''وہ اس ترنگ کی تھرتھری کو اپنے اندر محسوس کرنے لگی۔ یہ پہاڑ پر پوری قوت سے چڑھنے کا تھرل تھا۔ اسے لگا جیسے وہ گاڑی کی اس قوت سے پہاڑ کی اُونچائی پر رفتار کے ساتھ چڑھ رہی ہو..... اس کا جی چاہا اُونچائیاں اور زیادہ ہوں تا کہ گاڑی کے استعمال کی وہ مشینی آواز محسوس کرے جو اس کے جسم میں نشے کی کیفیت گھولتی جا رہی تھی۔ اس کا جی چاہا کہ اگر وہ خود گاڑی ہو تو زیادہ سے زیادہ سیدھی اُوپر چڑھتی پہاڑی کا انتخاب کرے تا کہ زیادہ سے زیادہ مزا آئے۔''

اور یہ احساس اس انسان کے اندر یہ شعور پیدا کر دیتا ہے کہ:

> ''جن چیزوں سے ڈر لگتا ہے، ان کی وہی کیفیت سب سے زیادہ خوبصورت ہوتی ہے۔ جب لوگ ان خوفناک سڑکوں سے مسلسل گزرتے ہیں تو یہ ٹیڑھا پن کسی سطح پر انسانی شعور میں خوف پیدا کرتا ہے۔ وہی ٹیڑھا پن اچھا لگتا ہے اور وہ حسن دراصل برتر ہو جانے کا احساس ہوتا ہے کہ یہ احساس انسانی روح کو چمکاتا ہے۔''

اور انسان جب اپنی تخلیقیت کو پا جاتا ہے یا اسے اپنی تخلیقی قوت کا عرفان ہو جاتا ہے تو وہ اپنی اس تخلیقیت سے دوسروں کے اندر کی تخلیقیت کو بھی بیدار کرنے لگتا ہے جیسا کہ نیرا کی تخلیقیت سے ڈی سی پی مسز بترا جاگی ہے یا اے۔ سی۔ پی الوک بدلا ہے۔ یہی نہیں بلکہ اس تخلیقی قوت سے راستے میں کھڑی مزاحم قوتیں بھی ہلنے اور ٹوٹنے لگتی ہیں جیسا کہ اس ناول میں اشوک ہلا ہے اور کمار ٹوٹا ہے۔

یہ تخلیقی قوت جسے ناول نگار اپنے ''مکان'' میں دکھانا چاہتا ہے یہ وہی تخلیقیت ہے جو گوتم بدھ کو گیا میں پیپل کے پیڑ کے نیچے دھیان کے

PDF Compressor Free Version

ذریعے ملی تھی، جسے خواجہ معین الدین چشتی نے کشف سے پایا تھا اور مکان کی نیرا نے جسے تصادم اور مسلسل جدوجہد سے حاصل کیا ہے۔

''مکان'' کو غصب کرنے والی قوتوں سے ٹکرانے، لوگوں پر بھروسہ کر کے امداد کے لیے مختلف دروازوں پر جانے اور گرم پر خار راستوں پر مسلسل بھاگتے رہنے کے دوران نیرا پر انکشاف ہوا کہ:

''یہ سارے بھروسے صرف اذیت پہنچاتے ہیں''

اور اس انکشاف پر جب اس نے سوچنا شروع کیا تو:

''سوچنے کے دوران اس نے محسوس کیا کہ اس کے دماغ کے ریشے ازسرِنو مرتب ہو رہے ہیں، جیسے اس سے کوئی ہولے ہولے کہہ رہا تھا۔ یہاں قدم قدم پر رہزن گھات میں بیٹھے ہیں، یہ بیسویں صدی کی نویں دہائی کی دلی ہے، یہ وہ شہر ہے جہاں کب رات ہوتی ہے اور کب دن نکلتا ہے، پتا نہیں چلتا۔ یہ وہ شہر ہے جہاں ہر انسان اپنی حفاظت کا آپ ہی ذمے دار ہے۔ یہاں بھروسوں کی تجارت ہوتی ہے، یہاں معاہدہ بنانے والے ایک ایک لفظ کے ہزاروں ہزاروں روپے لیتے ہیں اور اس شہر میں تم بھروسوں پر چل رہی ہو۔''

اور اسی سوچ کے بیچ اسے یہ بھی محسوس ہوا کہ:

''بچپن سے لے کر چند روز پہلے تک وہ زندگی کو جس روپ میں دیکھ رہی تھی وہ زندگی کا اصل روپ نہیں تھا، زندگی اس روپ میں تو بھیس بدل کر کھڑی تھی۔ وہ زندگی کا جو روپ اب دیکھ رہی ہے، یہ حقیقت ہے۔ زندگی کے اس روپ کے ایک ایک خدوخال کو غور سے دیکھنے کے لیے وہ بے چین ہو گئی۔''

اور جب وہ اصل زندگی کے خدوخال کی تلاش میں نکلی تو اس پر کائنات کے اسرار کھلنے لگے، اسے صاف دکھائی دینے لگا کہ:

''یہ سب کچھ جو وہ دیکھ رہی ہے، محض تماشا ہے اور زندگی ایک کھیل ہے اور اس کھیل میں جیتنے یا ہارنے کا احساس ہی اس کی روح ہے اور اسی روح کی گہرائی میں اس کی بقا مضمر ہے کہ لہروں کی طرح ڈوبتے اور اترا تے رہنے کا احساس ہی دائمی ہے اور اس احساس کی لہریں ہی ہر چیز کی اصل ہیں۔''

زندگی کی مزید باریکیوں کی تلاش کرتے ہوئے ایک دن اسے نیند آ گئی اور اس نے:

''نیند میں اپنے اندر ایسی کیفیت محسوس کی کہ اسے لگا کہ آج اس کی نیند حسب معمول نہیں تھی۔ صبح جب اس کی آنکھ کھلی تو اس کے اندر بدلتے موسموں والی بے چینی تھی۔ تم سب مجھے کیا سمجھتے ہو؟ اس نے ایک ایک کو کھا جانے والی نگاہ سے اپنے چاروں طرف کے ماحول کو، دیکھا۔ تم سمجھتے ہو کہ میں ایک کمزور لڑکی ہوں، میں عورت ہوں، میں ایک سمندر ہوں کہ جس میں پورا کا پورا پہاڑ غرقاب ہو سکتا ہے، لیکن میں جو کچھ اپنے اندر سہتی ہوں اس سے نئی چیزیں جنم لیتی ہیں۔ میں کوکھ ہوں۔ میرے اندر جو عکس پیدا ہوتا ہے وہ محض خیال نہیں ہوتا۔''

اس دن کے بعد نیرا کو یہ محسوس ہونے لگا کہ:

''اس کی زندگی کے نقوش اب اور تیزی سے یکے بعد دیگر بدلنے لگے۔ چند ماہ پہلے اس کے ذہن میں جو آتش فشاں پھوٹا تھا اور جس نے سب کچھ جلا کر راکھ کر دیا تھا، اس کی ایک ایک چنگاری سے سورج پیدا ہو رہا تھا۔''

اور اس سورج کے پیدا ہوتے ہی اس پر یہ راز روشن ہو گیا کہ:

''اپنی زندگی کے اُس دور میں جب وہ اندھوں کی طرح چل رہی تھی، لوگ اسے اپنے اشاروں پر دوڑاتے تھے اور وہ چوٹ کھاتی تھی تو ٹوٹ ٹوٹ جاتی تھی، لیکن اب یہ چوٹیں اور یہ دوسروں پر بھروسہ کرنا، ایک کھیل، ایک لذت آمیز عمل بن گیا تھا اور جیسے جیسے وہ اس آندھی کے ساتھ تیز حرکت میں آ رہی تھی، ویسے ویسے اس کو لگ رہا تھا کہ وہ ایک رقاصہ کی طرح دوسروں کے لیے سب کچھ کر رہی ہے، وہ اپنے آپ سے باہر نکل آئی تھی، اسے

PDF Compressor Free Version

ناچنے، دوڑنے، بھاگنے اور تھکنے میں لذت مل رہی تھی۔"

گویا اس طرح نیرا کی تخلیقیت اس پر آشکار ہوتی ہے اور وہ دبلی پتلی کمزور سی لڑکی مضبوط اور طاقتور ہوتی چلی جاتی ہے۔ تخلیقیت کی اس کہانی کے سلسلے میں خود ناول نگار کا یہ اقتباس ملاحظہ کیا جاسکتا ہے:

"انسان کے اندر جو تخلیقی اور اخلاقی صلاحیتیں ہیں ان کا استعمال کرنا ان سے رجوع نہ کرنا، اور اس گدھے کی طرح جو ایک جانور ہے، ذلت کا بوجھ اُٹھائے جانا، یا کتے کی طرح وفاداری کی دُم ہلائے جانا، انسان کی مٹی کا مذاق ہے، اپنی تلوار اپنے نگار خانۂ دل کی دیوار پر لٹکتی ہوئی چھوڑ کر غیر متناسب طاقتوں سے خالی ہاتھ لڑنا اور شکست کھا کر دوسروں کی بھی ہمت پست کرنا بے معنی ہے۔ نیرا اپنی اندرونی طاقت سے کہو کہ ان مسائل کا حل تلاش کرے، اس قوت سے جو تعمیر اور آزادی کا چشمہ ہے، جہاں پر تہذیبی مسئلوں کا حل ملتا ہے، جہاں سے سپہ سالار اور بادشاہ اپنا اعتماد حاصل کرتے ہیں، جہاں سے سائنسداں اپنی ایجادوں کا انجام لے کر آتے ہیں، جہاں سے فقیر بے نیازی کی دولت سے مالا مال ہوتے ہیں، جہاں سے

(بقیہ ص ۳۶ پر)

پیغام کاجانا

پیغام آفاقی سے میرے تعلقات طالب علمی کے زمانے سے ہیں۔ میں ریسرچ کر رہا تھا اور علی گڑھ جایا کرتا تھا۔ اسی زمانے میں جن چند دوستوں سے محبت اور قربت ہوئی ان میں غضنفر، طارق چھتاری، سید محمد اشرف، ابن کنول وغیرہ کے ساتھ پیغام بھی تھے۔ ہم لوگ قاضی عبدالستار کی صحبت میں زیادہ وقت گزارتے تھے۔ فکشن نگاروں کا ایک حلقہ بن رہا تھا، دوسرا حلقہ شاعروں کا تھا جو پہلے خلیل الرحمٰن اعظمی اس کے بعد شہریار کے اردگرد رہتا تھا، جن میں فرحت احساس، آشفتہ چنگیزی، عبید صدیقی، اسعد بدایونی وغیرہ خاص تھے، بہرحال علی گڑھ تھا شمشاد مارکیٹ تھا اور ٹی ہاؤس۔ دت جگے تھے تصویر محل اور ریلوے اسٹیشن ان سب میں پیغام کم سے کم شریک ہوتے تھے، غالباً وہ تاریخ کے طالب علم تھے اور ان کی منزل مقصود کچھ اور..... اور یہی ہوا کہ وہ پولس کی اعلیٰ ملازمت میں منتخب ہوئے اور قلم کے بجائے پستول یا ڈنڈا ہاتھ میں آگیا۔ ہم خوش ہوئے اور مایوس بھی کہ اب پیغام کا لکھنا پڑھنا گیا، لیکن ۱۹۸۹ء میں ان کا ناول "مکان" آیا اور دیکھتے دیکھتے اردو دنیا پر چھا گیا اور ساتھ غضنفر کا "مکان" اور عبدالصمد کا "دو گز زمین" بھی خوب مشہور ہوا تو پہلے میں سمجھا کہ "مکان" کی شہرت ناول کی وجہ سے کم پولس آفیسر کی وجہ سے زیادہ ہے، لیکن جب ناول پڑھا، غور کیا تو احساس ہوا کہ اس میں تازگی ہے۔ نئے مسائل ہیں، نیا اور اک و عرفان ہے، جو قاضی عبدالستار، جوگیندر پال وغیرہ کے ناولوں سے مختلف ہے، بس کیا تھا ہم نے ان تینوں ناولوں کو پڑھا لکھا اور خوب چرچے کیا اس جوش میں تنقید سے زیادہ دوستی کام آرہی تھی اور یہ احساس کہ پیغام نے اپنے اندر کے ادیب کو مرنے نہیں دیا۔ بس پھر کیا تھا ہم جب دہلی جاتے تو پیغام کے ساتھ شامیں گزرتیں اور بھی احباب ہوتے، بحثیں ہوتیں۔ صاف اندازہ ہوا کہ پیغام ادب کو بہت سنجیدگی سے لیتے ہیں اور بات گہرائی سے کرتے ہیں۔ کئی سمیناروں، مشاعروں میں ساتھ رہتا۔ اکثر وہ اپنے گھر پر محفلیں جماتے اور ہم ساری رات جاگتے۔ ہم نے ان راتوں کے تذکرے بھی کیے ہیں اور رپورتاژ بھی لکھے ہیں۔ پیغام پولس آفیسر ہوتے ہوئے بھی پورے طور پر کمٹیڈ ادیب تھے۔ ادب اور ادیب سے ان کی وابستگی بلکہ سپردگی والہانہ تھی۔ پوری سنجیدگی سے گہرائی سے باتیں کرتے۔ ان کے پاس مطالعہ کے ساتھ مشاہدے کا بھی خزانہ تھا جو ان کی کہانیوں، ناولوں میں نظر آتا۔ ہم لوگ اکثر ملتے تو صرف ادب، نیا ادب، نیا فکشن میں زیر بحث رہتا، وہ ایک تخلیق کار ضرور تھے، لیکن ان کے اندر غیر معمولی تنقیدی بصیرت بھی تھی۔ ان کے کئی مضامین اور اداریے اس کے ثبوت فراہم کرتے ہیں۔ ان میں کچھ کمزوریاں بھی تھی جو ہر انسان میں ہی ہوتی ہیں شاید وہ اس کمزوری یا بیماری کا شکار ہوگئے اور وقت سے پہلے ہم سے جدا ہوئے۔ "حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا۔"

——— علی احمد فاطمی، الٰہ آباد

PDF Compressor Free Version

پروفیسر صغیر افراہیم

پروفیسر شعبۂ اردو، مدیر ''تہذیب الاخلاق'' علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

وسیع کینوس کا فنکار: پیغام آفاقی

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ایک ہونہار طالب علم، اردو کے ممتاز تخلیقی صاحب قلم اور سرسید کے خوابوں کو عملی شکل دینے کا عزم رکھنے والے فنکار پیغام آفاقی ۲۰ راگست ۲۰۱۶ء کو محض ساٹھ سال کی عمر مکمل کر کے اس جہانِ فانی سے رخصت ہو گئے۔ اس خبر نے ذہنی اذیت میں مبتلا کر دیا کیوں کہ وہ اس دوران ملک کی موجودہ صورتِ حال کے پیش نظر تاریخ، تہذیب اور آزادی کے وسیع پس منظر میں ایک ایسا فن پارہ خلق کر رہے تھے جس میں انھیں ان علما کی خدمات کو افسانوی رنگ میں منعکس کرنا تھا جنھیں وطن عزیز کی سالمیت اور آزادی کی آواز بلند کرنے کے سبب سخت ترین سزائیں دی گئیں، حالاں کہ اس موضوع کو انہوں نے اپنے سابقہ ناول ''پلیتہ'' (سن اشاعت ۲۰۱۱ء) میں بھی ایک الگ انداز سے پیش کیا ہے۔ اس اہم ناول میں پروف کی کوتاہیوں اور بائنڈنگ کی غلطیوں نے قاری کو جھنجھلاہٹ میں مبتلا کر دیا، مگر متن کی اہمیت اور موضوع کی انفرادیت کی وجہ سے قاری نے ممکن حد تک انھیں دُرست کر لیا تھا۔

''پلیتہ'' کی اشاعت سے سات سال قبل جوگندر پال کالے پانی کی اذیت پر ''پار پرے'' کے عنوان سے ناول لکھ چکے تھے۔ انہوں نے پورٹ بلیئر کے توسط سے انگریزوں کی آمرانہ ذہنیت اور آزادی کے متوالوں کی کیفیت کو اجاگر کیا۔ جھوٹے الزامات یا پھر چھوٹے چھوٹے الزامات کے تحت معتوب لوگوں کو اس ویران جزیرہ میں بھیج دیا جاتا۔ قید کی طویل اور المناک مدت پوری ہونے کے بعد وہ باقی ماندہ زندگی گزارنے کے لیے یہیں بس جاتے، مگر یہاں بھی فرقہ پرستوں کی نظر پڑتی اور رفتہ رفتہ پرسکون بنائی گئی فضا درہم برہم کر دی جاتی ہے۔ پیغام آفاقی اِس تکلیف دہ صورتِ حال کو ایک بڑے پس منظر میں بیان کرتے ہیں۔ ادبی حلقہ واقف ہے کہ ناول ''پلیتہ'' جہاں ان بارودی سرنگوں کی نشان دہی کرتا ہے جن پر عالم گیریت اور صارفیت کا انحصار ہے، وہیں وہ ان مجاہدین کے ہیولے بھی تیار کرتا ہے جن کے لیے ''کالا پانی'' کی سزا تجویز کی گئی۔ ''پلیتہ'' میں انھوں نے بالواسطہ طور پر ان سرفروشوں کا ذکر کیا ہے جنھیں آزادی اور خودمختاری کی آواز اٹھانے کی سزا دی گئی اور یہ سزا ''کالا پانی'' کے نام سے مشہور ہے۔

پیغام صاحب کو اس کا احساس خود بھی تھا کہ یہ ایسا موضوع ہے کہ اس پر مزید کام کرنے کی ضرورت ہے۔ اسی مرکز و محور کے تعلق سے جب جب پیغام آفاقی سے گفتگو ہوئی تو میں نے اُن کے روبرو یہ درخواست رکھی کہ آپ تاریخ و تہذیب کے اُس پورے منظر و پس منظر کے تحت ایسا ناول خلق کریں جو نئی نسل کے ذہنوں کو اپنی عظیم وراثت کے تابناک پہلوؤں سے واقف کرا سکے۔ وہ خان محبوب طرزی، صادق سردھنوی، نسیم حجازی کی طرح محض تاریخ کا حصہ بن کر نہ رہ جائے بلکہ اس میں نئے سرے سے تاریخی حقائق کی مطابقت اور تطبیق (Readability) کے ساتھ دانشورانہ سوچ اور فلسفیانہ انداز اس طرح تحلیل ہو کہ اپنے قاری کو متحرک کرتے ہوئے نصاب کا حصہ بھی بن سکے۔

وہ اسے شدت سے محسوس کر رہے تھے کہ جنگ پلاسی سے کرانتی کاری آندولن تک مختلف صفات و کمالات کے ان گنت کردار ہیں جن میں جاں نثاری، بے لوثی، عزتِ نفس، محبت و مروت ہے۔ ان کے نقشِ قدم کی پیروی ملک کے سیاسی، سماجی، تہذیبی اور انتظامی منظر نامے سے تعصب اور تنگ نظری کو مٹا سکتی ہے۔ اس تصور کو فنکارانہ ڈھنگ سے واضح کرنا اس لیے ضروری ہے کہ یہ دور آمریت کا نہیں جمہوریت کا ہے اور یہ جمہوریت جن بزرگوں کے طفیل میں نصیب ہوئی ہے اُن کی

PDF Compressor Free Version

قربانیوں کو فراموش کرنا، دراصل حق و انصاف کا گلا گھوٹنا ہے۔

اتفاق سے جنوری ۲۰۱۱ء کے آخری ہفتہ میں اودے پور (راجستھان) میں ۱۹۸۰ء کے بعد اردو، ہندی، انگریزی ناول پر، ''بزمِ ادب''، شعبۂ اردو، گورنمنٹ میرا گرلس کالج میں ڈاکٹر ثروت خاں نے ایک اہم سمینار کرایا جس میں کئی دن پیغام آفاقی کا ساتھ رہا۔ دراصل طے شدہ پروگرام کے تحت ہم دونوں اپنی فیملی کے ساتھ پہلے سے پہنچ گئے تھے۔ خوبصورت جھیلوں کے اس شہر میں سمینار سے ہٹ کر گفتگو کا جو موضوع رہتا، وہ پوورٹ بلیئر، انڈومان نیکوبار تھا اور پھر گفتگو کا مرکز و محور بن جاتا ''ذرا یاد کرو قربانی''۔ وہاں یکسوئی سے ہونے والی مختلف نشستوں میں یہ اندازہ ہو گیا کہ مذکورہ خلا کو پر کرنے کا کام پیغام صاحب ضرور کریں گے۔

اس کے بعد جب جب دہلی جانا ہوا تو کبھی سرسید تحریک، کبھی ''تہذیب الاخلاق'' اور کبھی شاہ ولی اللہ کی تحریک مجاہدین کے تعلق سے طویل گفتگو ہوتی رہی۔ پچھلے سال (۲۶ر تا ۲۸ر فروری ۲۰۱۵ء) ہم پھر اودے پور میں بین الاقوامی اردو ادبی میلہ میں جس کا انعقاد ڈاکٹر ثروت خان نے کیا تھا، اکٹھے ہوئے۔ میں نے انھیں ''تہذیب الاخلاق'' کی مطلوبہ فائلوں سے کئی تحریریں دیں جو ان کے لیے بے حد کارآمد تھیں اور جنھیں دیکھ کر علما کے کارناموں سے بلکہ رسالہ ''تہذیب الاخلاق'' سے اُن کی انسیت اور بھی بڑھ گئی، حالاں کہ اس بار وہ سخت علیل تھے۔ اتنا وقت نہیں دے پا رہے تھے، پھر بھی انھوں نے بتایا کہ وہ ناول تو جلد ہی مکمل ہو جائے گا، دوسرے موضوع پر بھی کام شروع کر دیا ہے جو خواتین کی موجودہ صورتِ حال اور نفسیاتی کشمکش پر مبنی ہے۔ سمینار کی گہما گہمی سے باہر نکل کر وہ میرے کمرے میں آجاتے۔ سیما اور بھابی صاحبہ اپنے کاموں میں مصروف رہتیں۔ ہم دونوں کمرے میں، لابی میں یا پھر سیر کرتے ہوئے ادبی مسائل خصوصاً مذکورہ موضوع پر تبادلہ خیال میں مشغول رہتے۔ یہ ان کی عادت اور فطرت میں شامل تھا۔ اس سے انھیں ذہنی، جسمانی، روحانی سکون ملتا تھا اور یہ دین ''باغِ سرسید'' کی تھی۔

مجھے یاد ہے کہ ۱۹۷۵ء میں میرا بی۔اے (آنرز، انگریزی) میں داخلہ ہوا تھا۔ پیغام صاحب جن کا اصل نام اختر علی فاروقی ہے، تاریخ میں ایم۔اے۔ کر رہے تھے۔ پروفیسر سید وقار حسین صاحب میرے لوکل گارجین تھے اور پیغام صاحب بی۔اے۔ میں ان کے شاگردرہ چکے تھے۔ وہ اکثر کچھ نہ کچھ دریافت کرنے وقار صاحب کے پاس آتے رہتے تھے۔ میں آفتاب ہال کے ممتاز ہوسٹل میں رہتا تھا اور وہ محسن الملک ہال کے امین ہوسٹل میں۔ ممتاز ہوسٹل میں وہ علی سردار جعفری کے بھتیجے پرویز جعفری سے ملنے آتے تھے اور پھر آفتاب ہوسٹل ہوتے ہوئے شمشاد مارکیٹ چلے جاتے تھے۔ آفتاب ہوسٹل سول سروسز میں شریک ہونے والوں کا مرکز بنا ہوا تھا۔

پیغام صاحب کے ساتھ رضیہ سلطانہ صاحبہ بھی (جو بعد میں بیگم پیغام آفاقی ہوئیں) ہسٹری میں ایم۔اے۔ کر رہی تھیں۔ وہ بنگال کے صاحب ثروت گھرانے سے تعلق رکھتی تھیں۔ شادی کے بعد بھابی صاحبہ نے دہلی سے ایم۔اے۔ (اردو) اور قرۃ العین حیدر پر ایم۔فل۔ کیا۔ بیٹا امکان اور بیٹی ثنا اپنے والدین کی طرح ذہین اور بیحد محبت کرنے والے بچے ہیں۔ کئی سال کی مسلسل بیماری میں جس طرح رضیہ بھابی صاحبہ نے اپنے شوہر اور ان کی تخلیقات کے تعلق سے اہم کاغذات و مسودات کا خیال رکھا ہے وہ قابلِ رشک ہے۔ اس مصیبت کی گھڑی میں تلاوتِ کلام پاک اور درود کے ورد کے بعد شاید انہیں ذکر علی گڑھ سے کچھ سکون ملتا ہے۔

اوروں کی طرح مجھے بھی علی گڑھ سے انسیت ہے جس کے سہانے ذکر بچپن سے سنتا رہتا تھا۔ خوابوں سے بھرا ہوا ایسا ماحول جس میں دلی مسرت شامل ہو، اسی لیے بہت جلد یہاں کی فضا سے مانوس ہو گیا۔ دن کلاس کی آپا دھاپی میں گزرتے۔ شام کسی ادبی محفل میں حاضر ہونے پر اُکساتی۔ ممتاز ہوسٹل سے شمشاد مارکیٹ کے لیے اکثر قریب کے راستہ کو اختیار نہ کرتے ہوئے کینیڈی ہال ہوتا ہوا بازار کی طرف جاتا، محض اس وجہ سے کہ شاید جنرل ایجوکیشن سینٹر میں کوئی پروگرام ہو رہا ہو۔ اس مرکز میں فنونِ لطیفہ سے متعلق اکثر پروگرام ہوتے رہتے تھے۔ ایسی صورت میں وہیں ٹھہر جاتا۔

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے ابھی کل کی بات ہو ایجوکیشن سینٹر کے علاوہ کئی اور چھوٹے چھوٹے مراکز تھے جہاں طلبہ کی ادبی محفلیں

PDF Compressor Free Version

سجا کرتی تھیں، مثلاً الحمرا، رائٹرس فورم، لٹریری کلب، سنڈے کلب، کارواں کلب، گریٹ بک کلب میں کہانیاں سنی اور سنائی جاتی تھیں بلکہ اکثر یہ نظارہ رائل کیفے، کیفے ڈی فوس، کیفے ڈی لیلا، جئے جوان جئے کسان، سیون اسٹار، ٹی ہاؤس وغیرہ میں بھی نظر آجاتا تھا۔ ''بوم کلب'' اپنی الگ بہاریں بکھیرتا تھا۔ وہ طلبہ بھی دیر رات تک ان محفلوں کو آباد کرتے تھے جو مقابلہ جاتی امتحانات میں شریک ہونے کے منصوبے بناتے اور ان پر عمل کرتے۔ ۱۹۷۶ء میں پیغام آفاقی آئی۔ اے۔ ایس۔ کے امتحان میں شریک ہوئے اور آئی۔ پی۔ ایس۔ کی حیثیت سے کامیاب ہوئے۔ کیمپس میں خوشی کا ماحول تھا۔ دوکاندار مٹھائیاں تقسیم کررہے تھے۔ چائے کے پیسے کسی سے نہیں لیے جارہے تھے۔ شاید چاہت کا یہی وہ جذبہ تھا جو انھیں علی گڑھ اور ادب سے کبھی بھی دور نہیں کرسکا۔

میں اودھ کے ایک چھوٹے سے شہر اناؤ کا رہنے والا تھا، مگر میرے دوستوں کا حلقہ گوپال گنج، سیوان کا تھا۔ وجہ میرے کلاس فیلو ذوالفقار علی صاحب تھے۔ ان کے چچا سہراب صاحب جو اپنے بچوں اور بھتیجوں سے ملنے برابر علی گڑھ آتے رہتے تھے۔ وہ مجھے بھی بہت عزیز رکھتے تھے اور ان کی آمد پر پیغام صاحب ضرور حاضر ہوتے تھے۔ سہراب چچا کے مشفقانہ رویہ کی وجہ سے میں بہت سی محفلوں میں شریک ہونے لگا۔ نسیم عالم، پیغام آفاقی، خورشید احمد، مشتاق احمد، غضنفر، اظہار ندیم سبھی اس علاقہ کے نہ صرف ذہین طالب علم تھے بلکہ ادبی محفلوں کی جان بھی تھے۔ اس وقت تک سیوان، گوپال گنج اور چھپرا سب ڈویژن تھے۔ پیغام آفاقی کا گاؤں سارن موضع چاپ، سیوان میں تھا۔ اب تمام جغرافیے بدل چکے ہیں۔ سب منسلک ہیں تو محض ادب کی وجہ سے جو دین ہے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی۔ اللہ ہمیشہ اسے سرسبز وشاداب اور آباد رکھے۔

پیغام آفاقی کی پہلی پوسٹنگ پورٹ بلیئر ہوتی ہے۔ اجنبی فضا میں رفتہ رفتہ انھوں نے علی گڑھ کے ادبی ماحول کو ملوث کرلیا۔ دہلی میں اس ماحول کو اور بھی نکھار ملا اور چھوٹی چھوٹی تخلیقات شائع ہوتی رہیں، لیکن ۱۹۸۹ء میں جب ناول ''مکان'' منظر عام پر آیا تو اس نے قاری کو سوچنے پر مجبور کیا۔ اس کا کینوس بظاہر بڑے شہر (Metropolition City) میں مالک مکان اور کرایہ دار کے مابین رسہ کشی ہے، لیکن عمیق مطالعہ اور فلسفیانہ غور وفکر اس کے محدود دائرے کو لامحدود کرتا چلا جاتا ہے کہ کس طرح بڑی طاقتیں چھوٹے ملکوں کے گرد اپنی حاکمیت اور آمریت کے جال بنتی ہیں اور امن پسند ممالک بے بسی میں صرف امن پسند پرندہ کی طرح پھڑپھڑاتے رہ جاتے ہیں۔

افسانوی مجموعہ ''مافیا'' اور شعری مجموعہ ''درندہ'' میں بھی یہی کیفیات نظر آتی ہیں، لیکن ''مکان'' کے توسط سے قاری کو ایک متحرک اور بااثر کردار ''نیرا'' کی شکل میں ملتا ہے وہ سائنس کی تعلیم حاصل کرتے ہوئے اپنی ضعیف ماں کی نگہداشت کرتی ہے۔ ثانوی کردار سونیا، سایہ کی طرح شروع سے آخر تک اس کے ساتھ رہتی ہے اور زمانہ کی نباض بن جاتی ہے۔ کمار، نیرا کا کرایہ دار ہے۔ وہ عیار اور مکار ہے۔ لالچ، ہوس اور زور زبردستی اُس کی سرشت میں شامل ہے اور یہیں سے شروع ہوتی ہے ایک شریف لڑکی کی غاصب کرایہ دار سے اپنا مکان خالی کرانے کی جدوجہد۔

نیرا میں ادبی ذوق وشوق ہے۔ وہ اکیسویں صدی کی دہلیز پر دستک دینے والی تہذیب کی آہٹ کو محسوس کرتی ہے۔ مادی آسائش کی چمک دمک اور دولت کی ریل پیل کو دیکھتی ہے۔ سیدھے سادے شہریوں کی بے بسی اور مطلب پرست معززین سے واقف ہوتی ہے۔ وہ حاکموں کی بدعنوانی اور عدالتوں کی سفارشی اور سیاسی شعبدہ بازی کے ماحول میں اپنے اندر ایک خود اعتمادی محسوس کرتی ہے جو اس میں عزم اور حوصلہ پیدا کرتی ہے اور صنف نازک کی یہی اُبھرتی ہوئی قوت ناول ''مکان'' کو بااثر اور منفرد بناتی ہے۔

کردار نگاری کے اعتبار سے پیغام آفاقی نے جو فضا اور ماحول خلق کیا ہے اس میں ''مکان'' کا یہ نسوانی کردار سخت آزمائشوں سے گزرتا ہے، مگر فرار یا مفاہمت کا راستہ اختیار نہیں کرتا بلکہ اُس جانب قدم بڑھاتا ہے جس کی توقع آج کا حساس قاری اور کرۂ ارض کے امن پسند شہری کررہے ہیں، اسی لیے نیرا صنف لطیف کی تمام لطافتوں کے ساتھ قاری کو ایک نیا عزم اور حوصلہ عطا کرتی ہے کیوں کہ ناول کے اختتام میں اُس کا اُٹھا ہوا اگلا قدم نئی راہوں کا خود بخود تعین کردیتا ہے۔

فضا اور ماحول کو خلق کرنے میں پیغام آفاقی کو کمال حاصل ہے۔ ان کے لیے اس فضا کو پروان چڑھانے میں علی گڑھ کا ماحول بیحد

PDF Compressor Free Version

معاون رہا ہے۔ اے۔ ایم۔ یو۔ کا منظر اور پس منظر آپس میں ملاپ، محبت و بھائی چارے اور حصولِ علم کا تھا۔ مغربی بنگال پیغام آفاقی کے لیے تاریخ کے نئے ذر وا کرتا ہے جس میں خوشی بھی ہے غم بھی، جوش و جذبہ بھی اور کچھ کر دکھانے کی لگن بھی۔ ایک منظر کی پشت پر دوسرا منظر اور پھر اس سے پہلے جنگِ آزادی کا پہلا منظر۔

مئی ۱۸۵۷ء ہندوستان کی آزادی کا سنگ میل اس لیے قرار پاتا ہے کہ یہ نہ صرف اپنے پچھلے سو سال کا پس منظر پیش کرتا ہے بلکہ یہیں سے ہمیں ۱۹۴۷ء تک کے میدانِ جنگ کی تیاری کا نقشہ بھی ملتا ہے۔ ماضی کے دریچوں سے جھانک کر دیکھئے تو احساس ہوتا ہے کہ غلامی کی دستک کا جسے لاشعوری طور پر احساس ہوا ہے وہ صوبہ بنگال کا نواب سراج الدولہ تھا جو ۲۳؍ جون ۱۷۵۷ء کے دن پلاسی کے میدان میں ایک مجاہد کی طرح نظر آتا ہے اور رابرٹ کلائیو کے زیر قیادت ایسٹ انڈیا کمپنی کی سازش کا شکار ہو جاتا ہے۔ اپنوں کی سازش کی بدولت ہونے والی شکست پر رام نارائن موزوں تلملا اٹھتا ہے ۔

غزالاں تم تو واقف ہو، کہو مجنوں کے مرنے کی
دِوانہ مر گیا ، آخر کو ویرانے پہ کیا گزری

شعوری طور پر وطن کی عظمت، سالمیت اور آزادی کا خیال جس اولوالعزم شخص کے ذہن میں آیا اسے لوگ شیر میسور کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ ہم سب کے گلے میں غلامی کا طوق پڑنے کے باوجود ٹیپو سلطان کی شہادت رائیگاں نہیں گئی۔ چھوٹے چھوٹے ہندو مسلمان حکمرانوں نے اپنے اپنے انداز سے سیاسی اور انتظامی محاذ کو سنبھالنے کی کوشش کی، مگر صوفی سنت، پیر فقیر، سادھو سنیاسی بھی مذہبی، سماجی، ثقافتی اور تعلیمی بیداری میں مصروف ہو گئے۔ ایک جانب راجہ رام موہن رائے، رویندر ناتھ ٹیگور، کیشو چندر سین، گوبند راناڈے، سوامی دیانند سرسوتی، رام کرشن پرم ہنس عملی جدوجہد میں مصروف ہوئے تو دوسری طرف شاہ ولی اللہ، مجنوں شاہ، کرم شاہ، حاجی شریعت اللہ، شاہ عبدالعزیز، سید احمد نے بھی کام کیے۔

اتحاد و اتفاق اور عملی بیداری کو دیکھ کر انگریزوں میں خوف اور دہشت طاری ہو گئی اور پھر انھوں نے نہایت منصوبہ بند طریقے سے نفاق اور بغض و حسد کو فروغ دیتے ہوئے بے شمار ہندوستانیوں خصوصاً مسلمانوں کو گولیوں کا نشانہ بنایا، پھانسیوں پر لٹکایا، جلاوطنی اور کالے پانی کی سزائیں دیں، نہ جانے کتنے علما قید و بند کی حالت میں سخت ترین مصائب برداشت کرتے رہے۔ ان میں احمد اللہ شاہ، حاجی امداد اللہ، مولانا فضل حق خیرآبادی، مولانا لیاقت اللہ الہ آبادی، مولانا احمد اللہ مدراسی، مولانا کفایت علی مرادآبادی، مولانا رضا علی خاں عابدی، مولانا عنایت احمد کاکوروی، مولانا عبدالجلیل علی گڑھی، مولانا رحمت اللہ کیرانوی، مولانا رضی الدین بدایونی، مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا فیض احمد بدایونی وغیرہ کے نام اس طرح درج ہیں کہ جیسے جیسے اُن پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑے گئے ویسے ویسے اُن میں سرفروشی اور جاں نثاری کا جذبہ بڑھتا ہی گیا۔ بعد میں ان ہی کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے مولانا محمود الحسن، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا مظہر الحق، مولانا محمد علی جوہر، مولانا حسرت موہانی، مولانا آزاد سبحانی، مولانا ظفر علی خاں، حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر مختار احمد انصاری، مولانا عبدالباری، ڈاکٹر سیف الدین کچلو، مشیر حسن قدوائی، سید حسن امام وغیرہ نے اپنے علمی اور عملی کارناموں کے ذریعے استعماری قوتوں کا مقابلہ کیا اور غلامی کی زنجیروں کو توڑتے ہوئے آزادی کا اعلان کیا۔

پیغام آفاقی کو اِن بدلتے ہوئے مناظر کا احساس ہوسٹل لائف ہی میں ہو گیا تھا اور اِن پر غور و فکر کا سلسلہ اسی وقت سے جاری رہا۔ پیغام آفاقی نے اپنی تخلیقات میں معاشرے کو مختلف زاویوں سے دیکھنے کی کوشش کی اور اُن کے اظہار کے لیے الگ الگ اصناف کا سہارا بھی لیا، لیکن وہ کبھی بھی تاریخ، تہذیب اور اس کے عروج و زوال سے آزاد نہیں ہو سکے بلکہ جو نکتہ انھیں سب سے زیادہ سوچنے اور غور و فکر پر مجبور کرتا وہ ۱۸۵۷ء کا واقعہ تھا جسے کبھی غدر کہا گیا، کبھی کرانتی اور کبھی انقلاب کا نام دیا گیا۔

”پلیتہ“ میں بنگال کے منظر نامہ پر انگریزوں کا دارالسلطنت کلکتہ اُبھرتا ہے۔ دمدم ہوائی اڈے سے جزائر انڈمان کے شہر پورٹ بلیئر اور ہگلی ندی کے سہارے پیغام آفاقی نے اُس منظر کو پیش کیا ہے جہاں دانشور، شرفا اور علما سسکتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ راوی صیغۂ حاضر میں قاری کے ذہن کو ہموار کرنے کے لیے واضح کرتا ہے کہ:

PDF Compressor Free Version

''قیدی زنجیروں میں بندھے اس مادرِ وطن کو نم اور اُداس آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں جو اُن کی کوئی مدد نہیں کر پا رہی ہے۔'' (ص ۱۱۰)

فضا اور ماحول سے یہ بھی ظاہر ہو جاتا ہے کہ آبادی سے بہت دور اس ویران جزیرے کا انتخاب انگریزوں کی حکمت عملی میں شامل تھا جیسے:

(۱) آمریت کے مظاہرے کے لیے خوف اور دہشت پیدا کرنا۔
(۲) تجربات و ایجادات کے لیے محفوظ جگہ کا انتخاب کرنا۔
(۳) بغیر اُجرت کے قیدیوں سے من مانی مزدوری کرانا۔

ماضی کے سفر میں ''پلیتہ'' کا مرکزی کردار خالد اپنے پردادا یعنی شیخ عبدالرحمٰن بن خدا بخش بن میر علی تک کے واقعات کو سمیٹتے ہوئے، ماضی کو حال سے، غلامی کو آزادی سے اس طرح منسلک کرتا ہے کہ قاری خود محسوس کر لیتا ہے کہ تاجر حاکم اور دانشور محتسب کیوں کر ہو جاتا ہے:

''یہ لوگ تاجر اور حاکم نہیں تھے، بہت خطرناک اور ظالم شکاری تھے۔ ان لوگوں نے جزائر انڈمان میں مجرم بستی کے نام پر جو آبادی قائم کی تھی اور اس سلسلے میں انھوں نے جو ایڑی چوٹی کا زور لگایا تھا وہ ہندوستان کے مجرموں کو صرف وطن سے دور رکھنے کے لیے نہیں کیا تھا، یہ تو صرف ان کے دکھانے کے دانت تھے۔ انھیں تو انڈمان کو اپنے فوجی مقصد کے لیے آباد کرنا تھا اور پولیس اور عدالتوں کو باقاعدہ خفیہ ہدایات تھیں کہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کو سزائے کالا پانی دے کر بھیجا جائے۔'' (ص ۵۶)

اُس وقت بھی ظلم و بربریت کے خلاف اگرچہ لوگوں نے آواز بلند کی۔ خالد سہیل کی طرح اس کے بزرگوں نے بھی مقدمے دائر کیے، مگر انصاف کسی کو نہیں مل سکا۔

''کالا پانی اب اس کے لیے ایک ایسی کہانی تھا جس میں اس کے پردادا خود ایک سچ مچ کے کردار تھے اور اس طرح کالا پانی اس کے لیے ایک کہانی بھی تھا اور ایک مقدمہ بھی تھا اور وہ بھی سوا سو سال پرانا ایک ایسا مقدمہ جو پورے شد و مد کے ساتھ آج بھی ایک مقدمہ کے طور پر زندہ تھا۔'' (ص ۵۹ و ص ۶۰)

کردار کے اعتبار سے خالد کا کردار ناول پر چھایا ہوا ہے دیگر کرداروں میں منشی رام نرائن کا کردار، رام نرائن موزوں کی یاد دلاتا ہے اور کابل کے پٹھان شیر علی جس نے وائسرائے لارڈ میو کا قتل کیا تھا، وہ ٹیگور کے کابلی والا سے متاثر ہو کر خلق کیا گیا ہے جو ظاہر کرتا ہے کہ:

''انسانوں کی جان اور خون کی بھوکی اور پیاسی ایک اجنبی نئی دنیا یہاں آباد ہوتی رہی۔'' (پلیتہ ص ۱۷۳)

روشنی اور تاریکی کی جنگ ہمیشہ رہی ہے اور ہر بار یہ ثابت ہوا ہے کہ تاریکی عارضی ہے، شکست اُس کا نصیب ہے۔ ''کالا پانی'' کی سزا پانے والے اگر افسوس کر رہے ہیں تو اس پر کہ وہ جیتے جی نصب العین کو عملی جامہ نہیں پہنا سکے۔ خوبی یہ ہے کہ وہ اذیت ناک ماحول میں بھی مایوس نہیں ہیں۔ وہ جانتے تھے کہ باطل کامیاب ضرور ہوا ہے، مگر دیر تک حق کو دبایا نہیں جا سکتا۔ اُسے سرخ رُو ہونا ہی ہے کہ رُوسیاہی باطل کا مقدر ہے:

''جس طرح اوروں کو پہاڑیوں سے یا کسی پیپل کے پیڑ کے نیچے روشنی ملی تھی، اُسی طرح خالد کو بھی جزائر انڈومان میں روشنی ملی تھی، جہاں اس کا دل کالا پانی کی روشنیوں سے منور ہوا تھا۔'' (ص ۵۷۵)

گنگوتری سے نکلنے والی گنگا، بنگال کی کھاڑی تک سب کو سیراب کرتی بلکہ ''پاپیوں کے پاپ دھوتے ہوئے'' بنگال میں بظاہر کالے پانی میں تبدیل ہوتی ہے، مگر سیاہی کے سینے کو چیر کر، تاریکی کو دور کرتی ہوئی عام نظروں سے اوجھل ہو جاتی ہے، پھر سب کو سیراب کرتی ہوئی لوٹتی ہے جسے نادان اُلٹی گنگا سمجھتا ہے، مگر صاحب نظر اس فیض کرم سے واقف ہے۔ پیغام آفاقی اِن ہی آتی جاتی لہروں کے آہنگ سے انسانیت کے نغمے بکھیرتے ہیں اور پراگندہ کرنے والے مفاد پرستوں کو للکارتے ہوئے خود کو بھی ذمہ دار قرار دیتے ہیں:

''ہماری موجودہ حالت ایسی اس لیے ہے کہ ہم مجاہدین آزادی کے ناکارہ وارث ہیں۔'' (پلیتہ ص ۵۷۳)

ہمارے پیش نظر فی الحال پیغام آفاقی کے منے خلق ہونے والے ناول کے اقتباسات تو موجود نہیں ہیں تاہم ''پلیتہ'' جس کے توسط سے ان کے

PDF Compressor Free Version

ذہن کو ہموار کیا گیا تھا، اُس سے مستعار لیتے ہوئے نئے منظر نامے کو اس طرح تقویت پہنچا سکتے ہیں:

''میں اِن دنوں اپنے خون کا ایک ایک قطرہ نچوڑ کر اس میں ڈال رہا ہوں اور میں اتنا منتشر اور غم زدہ ہوں کہ مجھے بھوک بھی نہیں لگتی، ممکن ہے کہ اس کمزوری کی وجہ سے میری موت بھی ہو جائے..... میں جانتا ہوں کہ میں اتنا لاغر ہو گیا ہوں کہ مرنے کے قریب ہوں۔ کوئی چھوٹا سا صدمہ کبھی بھی میری جان لے سکتا ہے، لیکن اگر میں مر جاؤں تو اس کے بعد سے متعلق میری صرف ایک آرزو ہے کہ جس طرح میں نے اپنی وہ ذمہ داری پوری کی ہے جس کی مجھ سے توقع کی جا سکتی تھی، اسی طرح آپ اپنی اس ذمہ داری کو نبھائیں جس کی توقع اس کتاب کے لکھنے کے بعد مجھے آپ سے ہے۔'' (ص ۵۷۷)

دراصل ''۱۸۵۷ء'' ہندوستان کی نئی تاریخ رقم کیے جانے کا وہ باب ہے جس میں ہندوستانیوں میں آپسی نفاق کو ختم کرنے کا اعلانیہ ہے۔ یہ مذہب اور ذات پات سے بلند ہو کر ملک و قوم کے لیے جذبہ جاں نثاری کا مظہر بھی ہے۔ یہ سابقہ صورت حال کے محاسبہ اور تلافی کا در بھی ہے جو ظاہر کرتا ہے کہ کل تمام حساس افراد خصوصاً علما کو اس لیے اذیتیں دی گئیں کہ وہ صداقت کا سبق دے رہے تھے۔ آزادیٔ اظہار اور آزادیٔ رائے کو سمجھ رہے تھے۔ اُن کی بے مثال قربانیوں کی بدولت ہمیں آزادی تو مل گئی، لیکن رفتہ رفتہ اُن جاں نثاروں کے کارنامے جنھیں سنہرے حروف میں لکھا جانا تھا، نہ جانے کیوں صفحۂ قرطاس پر دُھندلے ہوتے چلے گئے۔ یہ کیسا لائحۂ عمل ہے؟ نذرانۂ عقیدت کا یہ کون سا طریقہ ہے کہ ہم آزادی کی نعمت سے مالا مال تو ہوئے، مگر اپنے محسنوں، رفیقوں سے چشم پوشی اختیار کرتے چلے جا رہے ہیں۔ آخر کیوں؟ پیغام آفاقی اسے ایک الگ زاویۂ نظر سے دیکھتے ہیں۔ کل وہ ''پلیتہ'' میں بھی اس کی تاویلیں پیش کر رہے تھے، مگر زیرِ قلم تحریر جس کا تفصیلی خاکہ وہ اودے پور میں ہم سب کو سنا چکے تھے، اُس میں وہ جوش نہیں ہوش سے کام لیتے ہوئے منطقی اور استدلالی اظہار پر زیادہ زور دے رہے تھے۔ اُن کا یہ نیا ناول جتنی جلد منظرِ عام پر آ جائے تو یہ نہ صرف پیغام آفاقی کے لیے سچا خراجِ عقیدت ہوگا بلکہ اس فن پارے سے ملک کے موجودہ منظر نامہ میں مسلمانوں کا وقار بھی بلند ہوگا۔ ❁❁

پیغام آفاقی: مقبول فکشن نگار

۲۰، اگست کا ۲۰۱۶ء کا دن تھا۔ لگ بھگ گیارہ بجے بجے تھے کہ مجھے مہر افروز نے ''ان بکس'' میں پیغام آفاقی کی موت کی اطلاع دی جو اُس صبح، انڈیا کے وقت کے مطابق پانچ بجے، اس دنیا کو خیر باد کہہ چکا تھا۔ میں اس وقت ایک مضمون لکھ رہا تھا اور ابھی نصف تک ہی پہنچ پایا تھا۔ میرا ہاتھ تھرک گیا۔ موت کسی کی بھی ہو، انسان کو ایک بار تو دہلا دیتی ہے، چاہے وہ کتنا ہی سنگ دل ہی کیوں نہ ہو، خاص طور پر جب مرنے والا اس سے عمر میں چھوٹا ہو اور زندگی کو اپنے ڈھنگ سے لڑ کر مزید زندہ رہنا چاہتا ہو۔ پیغام آفاقی سے میری ملاقات براہ راست نہ تھی البتہ فیس بک کے ذریعے گزشتہ چند سالوں سے ان سے ٹکراتا رہتا تھا۔ کبھی ابرار مجیب کے افسانہ فورم پر تو کبھی کسی اور فیس بکی ادبی نشست میں۔ کبھی کبھار ان سے ''ان بکس'' بھی گفتگو ہو جاتی۔ انہوں نے ایک بار بڑے چاؤ سے مجھے اپنا ناول ''مکان'' دہلی سے بھجوایا تھا اور میں ان کے دوسرے ناول ''پلیتہ'' کے بذریعہ ڈاک آنے کا منتظر تھا، لیکن موت کی خبر پہلے آن پہنچی۔ انڈین پولیس سروس سے جڑے اس ادیب کا سروس میں اِسی سال کے پہلے مہینے کی 9 تاریخ کو آخری دن تھا۔ انڈین سرکار اس کی مدت ملازمت میں توسیع کرتی یا نہ کرتی، یہ سوال الگ ہے البتہ فرشتۂ اجل تو اسے زندگی کی مہلت ہی نہ دینے پر تلا بیٹھا تھا۔ وہ تو منتظر تھا کہ کب میکس ہسپتال، شالیمار باغ، دہلی، انڈیا میں وینٹیلیٹر سے جڑے پیغام آفاقی کا دماغ سن ہو اور وہ سانس کی ڈور کاٹ ڈالے۔ نہ تو پیغام آفاقی غریب تھا، نہ زندگی میں ناکام، ادب کے اعتبار سے دیکھا جائے تو وہ سستے کاغذ پر چھپے رسالوں میں بھی نہیں چھپتا تھا، اس کے افسانے اور ناول اس کی زندگی میں ہی چھپے اور اسے اپنی زندگی میں وہ پذیرائی مل گئی تھی جس کا وہ حقدار تھا۔

—— قیصر نذیر خاورؔ، لاہور، پاکستان

PDF Compressor Free Version

ڈاکٹر قیام نیر

P.o. Bardaha, Via. Kamtaul, Dist Darbhanga 847304 (Mob. 9973743606)

ایک عظیم انسان، ایک عظیم فنکار: پیغام آفاقی

پیغام آفاقی ضلع سیوان کے موضع چانپ میں ۱۰ر جنوری ۱۹۵۶ء کو پیدا ہوئے۔ وہیں ابتدائی تعلیم حاصل کی، پھر علی گڑھ مسلم یونیورسیٹی سے انگریزی ادب میں بی اے اور تاریخ میں ایم اے کیا۔ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد یونین پبلک سروس کمیشن میں کامیابی حاصل کر کے انڈین پولیس سروس میں آئے اور ترقی کر کے دہلی کے پولیس کمشنر بنے، پھر وہیں سے ریٹائر ہوئے۔

ان کا نام اختر علی فاروقی اور ان کے والد کا نام شیخ عبدالجبار فاروقی تھا۔ انہوں نے اپنا قلمی نام پیغام آفاقی رکھا اور اس نام سے اخیر وقت تک لکھتے رہے۔ طالب علمی کے زمانے ہی سے لکھنے لگے تھے۔ دوران تعلیم کچھ نظمیں لکھیں پھر ایک ناولٹ ''آگنی'' لکھا جو شائع نہیں ہوا۔ افسوس اب وہ ہمارے درمیان نہیں رہے۔ ۲۰ر اگست ۲۰۱۶ء کو ان کا انتقال ہوا۔ ۲۱ر اگست کو اپنے آبائی وطن چانپ کے قبرستان میں سپرد خاک ہوئے۔

پیغام آفاقی کا ایک اہم ناول ''مکان'' ۱۹۸۹ء میں شائع ہوا جس کی وجہ سے انہیں کافی شہرت ملی۔ یہ ناول اردو ناول میں اس لئے نمایاں ہے کہ اس میں کرایہ کے مکان کے سلسلے میں باتیں کی گئی ہیں۔ اس موضوع پر کئی افسانے لکھے گئے ہیں، لیکن اردو کا یہ پہلا ناول ہے جو اس موضوع پر لکھا گیا ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر وہاب اشرفی فرماتے ہیں:

> ''یہاں موضوع کسی کرایہ دار کا انخلا نہیں ہے۔ کردار داخلی اور خارجی عوامل کے ساتھ زندہ اور متحرک ہیں، جن کا اپنا اپنا نقطہ نظر ہے۔ نیرا انصاف کے لئے مختلف قسم کے مراحل سے گزرتی ہے اور اس کے مقابل کا کردار کمار استحصال کے لئے۔ آخر میں فتح نیرا کا مقدر بن جاتی ہے۔ اس طرح یہ ناول ناگفتہ حالات اور سنگین ماحول میں جینے کا سبب بن جاتا ہے۔''

(تاریخ ادب اردو، ڈاکٹر وہاب اشرفی، ص ۱۳۷۱)

اس ناول میں کمار نام کا ایک کرایہ دار ہے جو نیرا کے مکان میں رہتا ہے۔ نیرا ایک ایسی تنہا خاتون ہے جس کا کوئی مددگار نہیں ہے۔ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر کمار اسے بے دخل کرنا چاہتا ہے۔ نیرا اس سے ٹکر لیتی رہتی ہے۔ اس کی کم عمری کو دیکھتے ہوئے قارئین کو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ ہتھیار ڈال دے گی، لیکن ایسا نہیں ہوتا ہے۔ نیرا ہر محاذ پر ڈٹی رہتی ہے۔ اسے تھانے اور تھانے دار کے معاملات سے بھی گزرنا پڑتا ہے، لیکن اس کا حوصلہ پست نہیں ہوتا ہے۔ سماج اور معاشرے میں عورتوں کی جو کمزوریاں سمجھی جاتی ہیں ان سے وہ گھبراتی نہیں ہے۔ حالات سے وہ خوفزدہ ہوتی ہے نہ پژمردہ۔ نہ اسے اپنی ہلاکت کا خوف ہوتا ہے اور نہ جنسی استحصال کا ڈر۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ایک آئیڈیل عورت بن جاتی ہے۔ اس کا تقابلی مطالعہ ''تلاش بہاراں'' کی ہیروئن سے کیا جاتا ہے، لیکن دونوں میں بڑا فرق نظر آتا ہے۔

اس ناول کے کرداروں کے ضمیر کی آواز جگہ جگہ ابھرتی اور ڈوبتی رہتی ہے جس سے ان کے اندر کی بات واضح ہوتی رہتی ہے۔

پیغام آفاقی کا ناول ''مکان'' دراصل نیرا اور کمار کی جدوجہد اور احتجاجی رویوں کی سرگزشت ہے۔ اس جدوجہد میں نیرا کامیاب ہو جاتی ہے۔ نیرا جو میڈیکل کالج کی طالبہ ہے۔ اس کے عزم و استقلال اور کارکردگی کو مصنف نے بڑے مؤثر طریقے سے بیان کیا ہے۔

مصنف نے دکھایا ہے کہ جب نیرا کو عدم تحفظ کا احساس جکڑ لیتا ہے تو وہ ایک اے سی پی آلوک سے مدد مانگتی ہے۔ آلوک اسے

PDF Compressor Free Version

یقین دلاتا ہے کہ کہ وہ اس کی پوری مدد کرے گا، لیکن رفتہ رفتہ اسے اندازہ ہوتا ہے کہ آلوگ اس کے مسئلے سے زیادہ اس میں دلچسپی لیتا ہے۔ ناول نگار نے اسے کس حقیقی انداز سے پیش کیا ہے:

''ایک دن تو نیرا نے اس سے کہا تھا کہ میں دیکھتی ہوں کہ آپ میرے مسئلے میں اتنی دلچسپی لیتے ہیں جتنا خود میں بھی نہیں لیتی۔ نیرا، اس وقت تو میری ساری تخلیقی صلاحیتوں کی آبرو داؤ پر ہے۔ تمہارا مقدمہ میرے یقین اور اعتماد کی راہ میں ایک بھاری پتھر بن کر اڑ گیا ہے اور میں اسے اپنے دل کے نازک ریشوں میں باندھ کر آہستہ آہستہ کھسکا رہا ہوں۔ کیا؟ وہ چونک گئی تھی۔ ہاں میں جو کچھ جھیل رہا ہوں تم اسے نہیں محسوس کر رہی ہو، اسی لیے چونک رہی ہو، لیکن میں جس جد وجہد میں لگا ہوں اس سے پیدا ہوتی ہلچل کی لہریں میرے چہرے اور میری آنکھوں پر ابھرتی ہیں، اٹھتی ہوئی شکل میں نہیں یہ بھاگتی ہوئی لہریں ہیں جن کا کوئی رنگ نہیں، میں تو بالکل نارمل دکھائی دیتا ہوں، حالانکہ ہوں نہیں۔''

پیغام آفاقی نے اس ناول میں پولیس کے داؤ پیچ کو اس بیباکی سے پیش کیا ہے کہ ناول حقیقت کے قریب تر پہنچ گیا ہے۔ نیرا کا کرایہ دار اس سے مکان چھیننے کے لئے ہر طرح کے ہتھکنڈے استعمال کرتا ہے۔ وہ پولیس کو سرمائے اور اثر ورسوخ کے ذریعہ اپنے حق میں کر لیتا ہے۔ چونکہ ناول نگار خود پولیس افسر تھے، اس لیے پولیس کے نظریہ کو کتنے پر اثر انداز سے پیش کیا ہے:

''میں اس لڑکی کو ایک مخصوص خوبصورتی سے ہینڈل کر کے انچارج اور یہاں کے پورے عملے کو دکھاؤں گا کہ ہمیں انوکھی صورت حال میں کیسے کام کرنا چاہئے۔ آپ دیکھئے تو رفتہ رفتہ تھانے اور کورٹ بھگاتے بھگاتے اور قدم قدم پر اسمارٹنس کا موقع دیتے دیتے، ساتھ ہی چابک دستی سے اس کے اوپر دباؤ بڑھاتے بڑھاتے، میں اس کے پرس کے پیسے اور آنکھوں کی چمک سب کچھ چھین لوں گا۔ وہ اس خوش گمانی میں رہے گی کہ وہ بہادری سے ہمارا مقابلہ کر رہی ہے اور اسے پتہ بھی نہیں چلے گا کہ وہ وہاں جا رہی ہے اور ان لوگوں سے مدد لے رہی ہے جہاں ہم چاہتے ہیں۔''

اس ناول میں پیغام آفاقی نے نسوانی کردار نیرا کو بڑی خوبصورتی اور ہوشیاری سے اُبھارا ہے۔ دولت مند لوگوں کے ظلم وستم کے خلاف اس کے ذریعہ آواز اٹھائی ہے۔ کمزور طبقے کو احتجاج کی آواز بلند کرنے کا ہنر سکھایا ہے۔ اس ناول کی کامیابی کا اندازہ درج ذیل اقتباسات سے لگایا جاسکتا ہے:

''اس ناول سے اندازہ ہوتا ہے کہ پولیس برادری اور معاشرے میں برائیوں کو فروغ دینے والوں کے درمیان ایک طرح کی سانٹھ گانٹھ ہوتی ہے۔ پیغام آفاقی کا تعلق چونکہ پولس محکمے سے ہے، اس لیے وہ اس کی باریکیوں اور نشیب وفراز کو زیادہ بہتر سمجھتے ہیں۔ نیرا کے کردار کو ناول نگار نے ایک Ideal بنا کر پیش کیا ہے مگر اس میں جد وجہد کا مادہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ پیغام آفاقی کا اسلوب سیدھا سچا ہے۔ کہیں کہیں سادگی میں مصنوعی اور بھاری بھرکم زبان در آنے سے اسلوب ناہموار ہوگیا ہے، پھر بھی انہوں نے شعور کی پختگی اور فنی بصیرت کا ثبوت دیتے ہوئے 'مکان' کی تکمیل کے بعد اپنا ایک اسلوب پیدا کر ہی لیا ہے۔'' (کوثر مظہری بحوالہ بہار میں اردو فکشن ایک تنقیدی جائزہ، احمد صغیر، ص ۷۲)

''پیغام آفاقی نے نہ صرف اسلوب پر محنت کی ہے بلکہ ماضی اور حال کے تصادم سے ایک نئی بستی یا ایک نئی دنیا آباد کرنے کی کوشش بھی کی ہے اور اس دنیا میں ہر وہ مسئلہ ناول کا حصہ بنتا ہے جو ہمارے آج کے عہد سے وابستہ ہے۔ فیمینزم، مارکیٹ اکانومی، گلوبلائزیشن، کرپشن، انسانی ولسانی حقوق، کارپوریٹ، کلچر، ورلڈ وار یا ورلڈ وار کی طرف بڑھتے قدم، پولرائزیشن اور ان کے

PDF Compressor Free Version

مابین حیات انسانی کے فلسفوں کی تلاش نہ صرف اس ناول کے مطالعہ کے لئے مجبور کرتی ہے بلکہ بنیادی مغالطوں سے بھی ہمیں باہر کا راستہ دکھاتی ہے کہ اردو ناول میں بڑے موضوعات شامل نہیں کیے جارہے ہیں۔''

(مشرف عالم ذوقی، ایوان اردو، دہلی، نومبر ۲۰۱۱ء، ص ۱۳)

اس ناول کی زبان سیدھی سادی اور عام فہم ہے، مگر اس میں ایسی انفرادیت ہے جو قاری کے دل پر گہری چھاپ چھوڑتی ہے۔ ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی اس سلسلے میں فرماتے ہیں:

''مکان طوالت اور بوجھل پن کے باوجود زبان و بیان کی ایسی خوبیاں رکھتا ہے جو قاری کو متاثر کرتی ہیں اور مصنف کی زبان و بیان پر قدرت کا اظہار بھی کرتی ہیں۔ اس میں نثر کے مختلف اسالیب کا سہارا لیا گیا اور روایتی بیانیہ، خودکلامی، شعور کی رو، مابعد الطبیعات، اساطیر اور فکر و فلسفے کی مدد سے ایسا متن تیار کیا گیا ہے جس میں فنکاری ہے، انفرادیت ہے اور انسانی اقدار کی بازیافت کا ایک روشن منور راستہ ہے جس پر ناول ختم کرنے کے بعد ہر قاری چلنا اور آگے بڑھنا پسند کرے گا۔''

(اردو ناول کے اسالیب، ص ۳۰۸)

پیغام آفاقی کے اس ناول ''مکان'' کو نہ صرف اردو میں مقبولیت حاصل ہوئی ہے، بلکہ عالمی ادب میں بھی یہ ایک قابل ذکر مقام رکھتا ہے۔ بہت سی زبانوں میں اس کے ترجمے ہو چکے ہیں۔ ۲۰۱۲ء میں امریکی حکومت کی مشہور تنظیم ''نیشنل انڈمنٹ فار آرٹ'' نے دنیا کے چند عظیم ناولوں کا انتخاب امریکی عوام کے مطالعے کا حصہ بنانے کے لیے کیا تھا، جس میں ''مکان'' بھی شامل ہے۔

پیغام آفاقی کا دوسرا ناول ''پلیتہ'' ۲۰۰۳ء میں منظر عام پر آیا تھا۔ ادبی حلقے میں اس کی بھی پذیرائی ہوئی، لیکن جو شہرت و مقبولیت ''مکان'' کو ملی وہ شہرت و مقبولیت اسے نہیں ملی، حالانکہ اس ناول کے ذریعہ مصنف نے دور حاضر میں پھیلی ہوئی بدنظمی، بدامنی، لاقانونیت اور سیاسی سودے بازی سے پردہ اٹھایا ہے اور انہیں دور کرنے کی کوشش کی ہے۔

پیغام آفاقی نے افسانے بھی لکھے ہیں۔ ان کا پہلا افسانہ ''لوہے کا جانور'' ماہنامہ ''آج کل'' دہلی ۱۹۷۵ء میں شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد وہ رک رک کر افسانے لکھتے رہے۔ تعداد کے لحاظ سے ان کے افسانے کم ہیں، لیکن کئی افسانے بے حد مقبول ہو چکے ہیں۔ ایک افسانوی مجموعہ ''مافیا'' ۲۰۰۲ء میں شائع ہو چکا ہے۔ ''پیتل کی بالٹی''، ''قطب مینار''، ''کوآپریٹو سوسائٹی''، ''مافیا''، ''بوڑھا ملازم''، ''مسافر''، ''بھوکمپ اور جوالا مکھی''، ''کیڑے کا دوسرا جنم'' اور ''آدم نو کے انتظار میں'' وغیرہ بے حد اچھے افسانے ہیں۔

پیغام آفاقی دور حاضر کے حالات سے اچھی طرف واقف ہیں۔ ان کی گہری نظر آج کے سماج اور ماحول پر ہے۔ انہوں نے سماج میں پیدا ہونے والے نئے نئے مسائل کو نہ صرف محسوس کیا ہے بلکہ قاری کے

قطعہ تاریخ وفات پیغام آفاقی

بخش دے اللہ پاک اب ان کے سارے ہی گناہ
اس کی رحمت ہی دکھائے گی فقط جنت کی راہ

جور پیشہ آسماں کا یہ رہا ہے ہی شعار
وارفانی نے کیا ہے آج تک کس سے نباہ

صدمہ اس رحلت سے پہنچا اہل اردو کو بہت
بزم سے جاتے رہے پیغام آفاقی بھی آہ

۲۰۱۶ء

——— پروفیسر عبدالمنان طرزی، دربھنگہ

PDF Compressor Free Version

سامنے پیش بھی کیا ہے۔ انسانی قدروں کے زوال اور سماجی رشتے کی گراوٹ ان کے دل میں کھٹکتی ہے، اسی لئے انہوں نے اپنے کچھ افسانوں میں انسانی قدروں کے زوال اور سماجی رشتے کی گراوٹ سے پیدا شدہ حالات کو بھی موضوع بنایا ہے۔ ''کوآپریٹیو سوسائیٹی'' میں انہوں نے جدید معاشرے کی شاطرانہ چالوں کو قاری کے سامنے پیش کیا ہے۔ جدید معاشرہ بہت سے لوگوں کو اچھا معلوم ہوتا ہے، لیکن اندر سے یہ کھوکھلا ہو چکا ہے۔ ہر آدمی ایک دوسرے پر انگلی اٹھانا چاہتا ہے، لیکن خود اپنے اندر جھانک کر نہیں دیکھتا۔ مفاد پرستی لوگوں کے اندر اس قدر گھر کر گئی ہے کہ تھوڑے سے فائدے کے لئے وہ کئی کئی چال چل جاتے ہیں۔ احمد صغیر کہتے ہیں:

''افسانے 'مافیا' ہو 'پیتل کی بالٹی' یا 'قطب مینار' بدلتے ہوئے حالات، اونچی سوسائٹی میں در آنے والی خرابیاں، زندگی کو دیکھنے سمجھنے اور برتنے کا اپنا ایک نظریہ رکھتے اور تخلیقی لمحوں میں کردار، واقعات، حادثات اور اپنے داخلی و خارجی احساسات و جذبات کے فطری تقاضوں کو پورا کرتے ہیں۔'' (اردو افسانے کا تنقیدی جائزہ، احمد صغیر، ص ۱۳۸)

پیغام آفاقی کے زیادہ تر افسانے مختصر ہیں، لیکن جامعیت کا ہنر بہر حال ان کے یہاں بدرجہ اتم موجود ہے۔ ان کے زیادہ تر افسانے صیغۂ واحد متکلم میں ہیں۔ مختلف موضوعات پر انہوں نے افسانے لکھے ہیں۔ علامتی رجحان کے تحت بھی انہوں نے کئی اچھے افسانے لکھے۔ ان کی علامتیں مبہم نہیں ہوتیں۔ اس سلسلے میں احمد کفیل کی بات بہت حد تک درست معلوم ہوتی ہے:

''پیغام آفاقی نے بھی اپنی اچھی کاوشیں پیش کی ہیں۔ ان کی علامت نگاری کی اہم خصوصیات یہ ہے کہ ان کی علامتیں پیچ در پیچ پردے نہیں ڈالتیں بلکہ حقیقت سے ہم آمیز ہو کر قاری کے ذہن کو اس نکتے کی طرف موڑتی ہیں جس کا حاصل اس علامت سے تعلق رکھتا ہے۔ ان کے افسانوں میں صنعت گری نہیں، فطری پن ہے۔'' (احمد کفیل مشمولہ، بہار کے چند نامور افسانہ نگار، مرتبہ رابعہ مشتاق، ص ۲۶۱)

ناول کی طرح اپنے افسانوں میں بھی آفاقی نے عام فہم زبان استعمال کی ہے۔ خوبصورت اسٹائل اور حسین اسلوب نے انہیں افسانہ نگاری میں بھی ایک انفرادیت عطا کر دی ہے:

''یہ چہ چہ زوروں سے ہوا کہ سوسائٹی کے امکانات بیحد روشن ہیں اور ملک کی دوسری سوسائیٹیوں نے تو اتنی ترقی کی ہے کہ سو، سوا راکین کی سوسائٹیاں اب منافع اور سرکاری مراعات کی وجہ سے کروڑوں کی مالک ہو گئی ہیں اور کئی سوسائٹیاں تو اب پونجی پتیوں سے مل کر یہ بھی کرنے لگی ہیں کہ ان کے سامان کو بھی اپنے کھاتے کے ذریعہ بیچتی ہیں تا کہ اس سے ٹیکس کی بچت ہو۔''

(کوآپریٹو سوسائٹی)

مختصر یہ کہ پیغام آفاقی نے زندگی میں پیدا شدہ مسائل کو فطری انداز میں دلکش انداز سے پیش کیا ہے، اس لئے ان کے افسانے اہمیت کے حامل ہیں۔ پیغام آفاقی نے دوران تعلیم کچھ نظمیں لکھیں، پھر گاہے گاہے شاعری کرتے رہے۔ ان کا ایک شعری مجموعہ ''درندہ'' کے عنوان سے منظر عام پر آ چکا ہے۔ بیشک پیغام آفاقی ایک عظیم انسان اور ایک عظیم فنکار تھے۔ اردو ادب میں ان کی حیثیت ہمیشہ نمایاں رہے گی۔

ہماری ذمہ داری

انسانی ذہن لامتناہی بیجوں کا ذخیرہ ہے اور یہ دنیا مسلسل ارتقا پذیر ایک باغ ہے اور تم اس باغ میں، نئی تیز ہواؤں کے درمیان کھڑے ہو..... یہی وہ راز ہے جس کا جاننے والا تہذیب انسانی کی رہنمائی کا حق ادا کر سکتا ہے اور جو اس راز سے جتنا دور رہتا ہے، وہ اسی قدر بے بسی کی اذیت میں لپٹا رہتا ہے..... کائنات کی تبدیلی کے اس راز کی لگام اپنے ہاتھ میں لو اور انسان ہونے کا حق ادا کرو ..... یہ دنیا تمہاری کھیتی ہے..... تم اس کے دہقان ہو..... یہ تمہاری ذمہ داری ہے۔

(پیغام آفاقی کے ناول ''پلیتہ'' ص ۵۹۳ سے ماخوذ)

PDF Compressor Free Version

رقیہ نبی
Ph.d, Research Scholar, Deptt. of Urdu
Maulana Azad National Urdu University, Hyderabad 32 (Mob. 9032904875)

ناول ''مکان'' کا تانیثی مطالعہ

چار سو صفحات اور بتیس ابواب پر مشتمل ناول ''مکان'' اپنی انفرادیت کی بنا پر بے حد مقبول ہو چکا ہے اور تخلیق کار پیغام آفاقی کو واحد اسی ایک ناول نے ممتاز ناول نگاروں کی صف میں کھڑا کیا ہے۔ ناول ''مکان'' اپنے مخصوص فلسفہ حیات، فن اور ہیئت کے اعتبار سے ایک منفرد کارنامہ ہے۔ نوجوان فنکاروں کو نئی بصیرت بخشنے کے علاوہ اس ناول نے فن ناول نگاری کی نئی راہیں متعین کرنے میں بھی اہم رول ادا کیا ہے۔ اپنی مقبولیت کے سبب جن ناولوں نے اپنے اپنے عہد کے افسانوی ادب کا رخ موڑ دیا، ان میں ناول ''مکان'' بھی شامل ہے، جسے یوپی اردو اکادمی کی جانب سے انعام سے نوازا جا چکا ہے۔ اس ناول کی مقبولیت کے سبب اس کے ہندی اور انگریزی ترجمے بھی شائع ہو چکے ہیں۔ آج سے پچیس سال پہلے اس ناول کی اشاعت سے اردو ادب میں ایک ہلچل سی مچ گئی تھی جس کا اندازہ ''مکان'' سے متعلق لکھے گئے ادیبوں اور ناقدوں کے مضامین اور خطوط پڑھنے سے ہوتا ہے۔ ظفر پیامی اپنے خط میں پیغام آفاقی کو لکھتے ہیں:

> ''آپ کا ناول اس لئے خاص طور پر پسند آیا کہ آپ نے ایک عام زندگی کی ایک عام سی واردات میں آفاقی رمزیت کو اجاگر کر کے فکشن کی بہترین روایتوں کی پیروی کی ہے۔ پلاٹ میں قاری کی دلچسپیاں اور فنی تہہ داری کو قائم رکھ کر آپ نے جو قابل قدر کارنامہ انجام دیا ہے اس کے لئے دلی مبارکباد قبول فرمائیے۔''(۱)

پروڈیوسر ڈائرکٹر ساجد اعظم یکم اکتوبر بروز جمعرات ۱۹۹۰ء میں پیغام آفاقی کو اپنے خط میں لکھتے ہیں:

> ''آپ کا ناول احساسات اور مشاہدات کے ساتھ ساتھ تلخ حقیقتوں کا آئینہ ہے اور آج کے دور کی اس بے چینی کی علامت ہے جو انسان کو آہستہ آہستہ آدم خور درندوں کی شکل میں بدل رہی ہے۔ محبت، چاہت، خلوص، ہمدردی، دوستی، انسانیت یہ تمام جذبے اور انسانیت کے اعلیٰ اقدار خود غرضی اور ذاتی مفاد کی بھٹی میں جل کر ناول کا خاص پہلو ناول کے کرداروں کی خودی، (شخصیت) کا نفسیاتی تجربہ ان کے محسوسات کا فلسفیانہ جائزہ بھی ہے۔ میری عین خواہش ہے کہ آپ کے اس ناول کو سیریل کی شکل میں بنا کر دہلی دوردرشن کے لئے منظوری کے لئے روانہ کردوں۔ آپ کا ناول ایک لڑکی کے مسائل کا احاطہ ہے جو موجودہ دور میں اپنی پہچان کی جدوجہد کر رہی ہے۔ ناول میں ایسے بے شمار واقعات اور موڑ ہیں جو ایک سیریل کی جان بن سکتے ہیں اور دیکھنے والوں کو موجودہ معاشرے کے گھناؤنے پہلوؤں سے روشناس کیا جا سکتا ہے۔''(۲)

پیغام آفاقی نے روزمرہ کی زندگی کے مسائل میں سے ایک ایسے مسئلے کا انتخاب کیا ہے جو بہ ظاہر عام تو ہے، لیکن اہمیت کا حامل ہے۔ دیکھا جائے تو ناول کا موضوع بہت نیا نہیں ہے، اس سے پہلے بھی بہت سے تخلیق کار استحصال پر مبنی کہانیاں بیان کر چکے ہیں، مگر اس ناول کی انفرادیت یہ ہے کہ اس میں استحصال کے خلاف احتجاج کو بھرپور انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ ایک یتیم اور بے سہارا مالک مکان نیرا کے گھر میں بیٹھا کرایہ دار کمار پراپرٹی ڈیلر مدن گوپال کے اکسانے پر اس کا مکان ہڑپنے اور اسے بے گھر کرنے کی غرض سے طرح طرح کے ہتھکنڈے

PDF Compressor Free Version

اپناتا ہے اور اس کام میں پولیس انسپکٹر اور اس کے دولت مند دوست اشوک وغیرہ بھی ساتھ دیتے ہیں۔ چونکہ کمار ایک تاجر ہے اور ہر وقت اپنے کاروباری فائدے کے لئے سوچتا رہتا ہے۔ نیرا کے مکان پر قبضہ جمانے کے پیچھے بھی اس کا یہی مقصد رہتا ہے۔ وہ ہر کام پیسوں کے بل پر نپٹانے کا عادی ہوتا ہے اور نیرا کے مکان کو حاصل کرنے کے لئے بھی وہ ایک لاکھ روپیہ کا خرچہ اٹھانے کے لئے تیار ہو جاتا ہے کیونکہ اس ایک لاکھ کے بدلے میں اسے چار لاکھ روپیوں کا فائدہ ہونے والا تھا اور یہیں سے کمار کی دولت اور تنہا نیرا کی قوتوں کی لڑائی شروع ہو جاتی ہے۔ کمار سازشیں رچا کر نیرا اور اس کی بوڑھی اور ذہنی تناؤ کی مریضہ ماں کو گھناؤنے طریقے سے پریشان کرنے کا کوئی بھی موقع نہیں چھوڑتا۔ اسے لگتا ہے کہ اس کی سازشوں اور مقدمات سے تنگ آ کر اور گھبرا کر نیرا اپنی ماں کو لے کر مکان چھوڑ کر بھاگ جائے گی، مگر ہوتا اس کے برعکس ہے۔ وہ اپنی ہمت اور استقلال سے ہر ایک مصیبت کا ڈٹ کر مقابلہ کر کے کمار کی تمام سازشوں کو ناکام کر دیتی ہے اور آخر کار مکان پر اس کا قبضہ باقی رہتا ہے۔ وہاب اشرفی ناول ''مکان'' کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''پیغام آفاقی کا ناول 'مکان' اپنے محتویات کے لحاظ سے خاصہ مابعد جدید رویے کا حامل معلوم ہوتا ہے۔ اس کے متون میں دریدا کے فکر کی لہریں صاف نظر آتی ہیں، حالانکہ مجھے یقین ہے کہ پیغام آفاقی نے جس وقت یہ ناول قلمبند کیا ہوگا، ان کے ذہن میں کہیں دور دور بھی دریدا نہیں ہوگا۔ پھر بھی جو تصورات پیش کئے گئے ہیں وہ حیرت انگیز طور پر دریدائی ہیں۔''(۳)

بظاہر ناول کا پلاٹ مختصر سا معلوم ہوتا ہے، لیکن اندر سے پلاٹ کی پرتیں جس انداز سے کھلتی جاتی ہیں، قاری کی دلچسپی بھی اسی انداز سے بڑھ جاتی ہے اور ہمارے معاشرے میں موجود بہت سارے چھپے ہوئے حقائق کا پردہ بھی فاش ہوتا دکھائی دیتا ہے۔ ڈاکٹر احسن فاروقی لکھتے ہیں:

> ''کامیاب ناول وہی ہے جس کا پہلا جملہ قصہ شروع کر دے، توجہ کھینچ لے، دل کو لگا لے، دلچسپی شروع ہو جائے۔ یعنی اس میں قصے کے بہت سے دھاگے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے ہوں، سب دھاگوں کا سرا پہلے باب میں ہاتھ میں آ جائے۔''(۴)

''مکان'' اس لحاظ سے بھی کامیاب ناول ہے کیونکہ اس کا پہلا ہی جملہ قاری کی توجہ کھینچ لیتا ہے۔ یہ پہلا اقتباس ملاحظہ کیجئے:

> ''یہ ایک سنگین مسئلہ تھا۔ نیرا کا مکان خطرے میں تھا۔ اس کا کرایہ دار کمار اس سے اس کا یہ مکان چھین لینا چاہتا تھا۔ وہ اب تک اپنے مکان میں بڑے چین سے تھی۔ اس کے ساتھ اس گھر میں صرف اس کی ماں تھی، مکان کے آدھے حصے میں وہ کرایہ دار تھا جو کرایہ کی ایک معمولی رقم دیتا تھا۔ نیرا میڈیکل کی طالبہ تھی اور تعلیم مکمل ہونے کے بعد وہ اسی مکان میں ایک نرسنگ ہوم کھولنا چاہتی تھی۔''(۵)

نیرا کا مکان خطرے میں کیوں تھا؟ آخر کرایہ دار اس کا مکان کیوں چھیننا چاہتا تھا؟ کیا وہ چھیننے میں کامیاب ہو گیا؟ یا پھر نیرا اپنے مکان کو بچانے میں کامیاب ہوئی؟ ان سوالات کا جواب جاننے کے لئے قاری کا تجسس بڑھتا جاتا ہے۔ جس طرح ناول کا پہلا ہی جملہ مرکزی خیال سے ہمیں قریب کر دیتا ہے۔ اسی طرح اس ناول کے کردار بھی بنا کسی تکلف کے بھرپور تعارف کے ساتھ ہمارے روبرو آ جاتے ہیں اور پھر شروع سے آخر تک ایک تجسس حرارت کے ساتھ قائم رہتا ہے۔

نیرا کا یہ مکان دہلی شہر کے بیچ میں واقع ہے اور دہلی شہر میں زندگی کے ہر شعبہ حیات میں ترقی کے ساتھ ساتھ نیرا کے مکان کی قیمت بھی بڑھتی جا رہی تھی اور اس بڑھتی ہوئی قیمت کے سبب نیرا بھی اپنے مستقبل کے سپنے سجانے لگی تھی، لیکن اسے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ اس کے گھر میں اپنی بیوی اور بچوں کے ساتھ رہ رہا کمار اسے ہی بے گھر کرنے کا منصوبہ بنا رہا ہے اور جب اسے اس بات کا احساس ہونے لگتا ہے تو اس کے دل پر چوٹ لگتی ہے۔ کمار کی نیت بدلتے اور اپنے مستقبل کو تاریک ہوتے ہوئے دیکھ کر نیرا گھبرا جاتی ہے کیونکہ وہ ابھی دنیا سے پوری طرح واقف ہی نہیں ہوئی تھی۔ اس پر سماج اور لوگوں کے اس کھوکھلے پن کا آج پہلی بار انکشاف ہوا تھا، ورنہ اس کا دھیان تو صرف

PDF Compressor Free Version

اپنی پڑھائی پر لگا رہتا تھا۔ اس کو اس بات کی بھنک بھی نہ ہو پائی کہ کب کرایہ دار اس کے مکان میں دلچسپی لینے لگا تھا اور کب بدامنی اس کے دروازے پر دستک دے گئی تھی۔ ان باتوں کو وہ ٹھیک سے دیکھ نہیں پائی تھی۔ یہ اقتباس دیکھئے:

"کچھ دنوں کے بعد اسے یہ محسوس ہوا کہ کمار اپنی دولت کی ان دیکھی قوتوں کا سہارا لے کر اس کے پورے مکان کو ہڑپ لینا چاہتا ہے تو وہ گھبرا گئی، پھر جب اس نے کمار کے قدموں کو روکنے کی کوشش کی اور لوگوں کے پاس مدد کے لئے گئی تو دیکھا کہ تمام لوگوں کے چہرے اور تمام چیزوں کے رنگ بدلنے لگے تھے۔ اسے لگا کہ اس کے مکان کی چھت اب آسمان تک اُٹھ گئی تھی اور اس کی دیواریں افق تک بھاگ گئی تھیں۔" (۶)

ناول میں نیرا طبقہ نسواں طبقے کی نمائندہ بن کر ابھرتی ہے، جس کو کم عقل، کمزور اور بے بس سمجھ کر پدرسری سماج صدیوں سے اپنے مظالم کا شکار بناتا آیا ہے، جس کو سماج کے ٹھیکے دار سہارا دینے کے بجائے الٹا اس کا استحصال کرنے لگتے ہیں، مگر نیرا پدرسری معاشرے سے لڑ کر اپنی خود اعتمادی کا ثبوت دیتی ہے اور زندگی کے جن تجربات سے گزرتی رہتی ہے ان تجربات کا بہترین احاطہ اس ناول میں کیا گیا ہے۔ وہ جس طرح سے اپنی زندگی میں رونما ہونے والی مشکلات اور الجھنوں کا ڈٹ کر مقابلہ کرتی ہے۔ اس سے اس کی تانیثی احساسات اور شعور سے پر شخصیت واضح طور پر ہمارے سامنے آجاتی ہے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر مولا بخش لکھتے ہیں:

"آفاقی نے فکشن اور فلسفہ کی فنکارانہ آمیزش سے 'مکان' کا متن تیار کیا ہے اور اردو ناول کو امراؤ جان، دھنیا، لاجونتی وغیرہ سے بھی بڑا اور مکمل تانیثی کردار نیرا کی شکل میں دیا ہے جو بیسویں صدی کے تہذیبی انتشار کا استعارہ بن جاتا ہے۔ نیرا کی جنگ انسان کی معصومیت اور عورت کی صلاحیت کو بچانے کی جنگ کے ساتھ ساتھ ہندوستانی تہذیب کے تحفظ کی جنگ معلوم ہوتی ہے۔" (۷)

سماج کے اہم اراکین میں مرد کی طرح عورت بھی شامل ہے اور سماج کی تعمیر و تشکیل اور ترقی میں اس کا بھی وہی حصہ ہے جو مرد کا ہے۔ اسے وہ تمام حقوق حاصل ہے جو ایک مرد کو سماج کی طرف سے پہلے ہی دیے گئے تھے اور یہ سب تبھی ہوا جب خواتین نے ناقابل برداشت غلامی اور ظلم و جبر کے بوجھ کو اتار پھینکا اور سماج کے استحصالی رویوں کے خلاف آواز بلند کی۔ آخر کار ان کے احتجاجی مظاہروں نے باقاعدہ تانیثیت نام کی تحریک کو جنم دیا۔ اسی تحریک کی بدولت روشن خیال تانیثی مفکروں نے مرد اور عورت کے درمیان سماجی، سیاسی اور اقتصادی نابرابری کو ختم کرنے کے مطالبات کیے۔

تانیثیت کی تحریک کے وجود میں آنے کے بعد عورت درجہ بدرجہ کیسے ترقی کرتی رہی ہے اور سماج کے ذریعے کیے گئے مظالم کے خلاف وہ کیسے اپنے صبر اور ڈر کا لبادہ پھینک کر بے باکی سے احتجاج پر اتر آئی ہے اس کی بہترین مثال نیرا بھی ہے۔ وہ اکیسویں صدی کی ایک ایسی لڑکی ہے جو اپنے حقوق پہچانتی ہے اور اس کے اندر مرد کے ظالمانہ اور استحصالی رویوں کے خلاف بغاوت کا مادہ موجود ہے۔ اس کی نگاہوں کے سامنے عالمی منظر نامہ موجود ہے۔ وہ سماج کے نئے طور طریقوں، سائنسی ایجادات اور آلات سے بھی باخبر ہے اور خود سائنس کی طالبہ ہو کر تجرباتی اور تجزیاتی نقطہ نظر کو استعمال کرنے کا ہنر بھی اپنے اندر رکھتی ہے۔ اس کی مخالفت میں بیٹھا اس کا کرایہ دار اور دیگر مرد اس کی نسوانیت کو اس کی کمزوری سمجھتا ہے، لیکن تانیثی احساس و شعور سے مکمل طور پر آگاہ نیرا کو اپنے عورت ہونے کا غرور ہے۔ اس کے اندر لجاجت بالکل نہیں ہے بلکہ اس کے ارادے نہایت بلند ہیں۔ پیغام آفاقی نے نیرا کو جو کارنامے انجام دیتے ہوئے دکھایا ہے وہ نسائی کرداروں کی دنیا میں ایک انمٹ چھاپ کی حیثیت رکھتے ہیں۔

تانیثیت کی تحریک عورت کو محض جمالیاتی نقطہ نظر سے دیکھنے کے بھی خلاف ہے اور اس ناول کو پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ "مکان" کا مصنف عورتوں کو محض جمالیاتی نقطہ نظر سے دیکھنے اور ان کی جنسی تعریفوں کا قائل نہیں۔ اس بات کا اندازہ اس کے مجموعہ "مافیا" کے پیش لفظ سے لئے گئے اس اقتباس سے بھی بہ خوبی لگایا جا سکتا ہے:

"میرے یہاں جدت فکر ایک تقاضے کے طور پر نمودار

PDF Compressor Free Version

ہوتی ہے۔ مثلاً میرے ناول میں عورت کو مکمل طور پر بحیثیت انسان دکھایا گیا ہے۔ جہاں وہ ایک انسان کی حیثیت سے زندگی میں پیش آنے والے سیاسی، معاشی اور معاشرتی مسئلوں کو حل کرتی ہے۔ میرے یہاں عورت کا کردار پیش کرتے وقت لازمی طور پر اس کی جنس کو اس کی انسانی شخصیت سے اوپر نہیں رکھا گیا بلکہ جہاں کردار عورت ہے وہاں بھی جنس اسی طرح ثانوی حیثیت رکھتی ہے جیسے ہمارے یہاں روایتی فکشن میں مرد کے کردار میں جنس ثانوی حیثیت رکھتی ہے۔''(۸)

اسی فکر کا نتیجہ ہے کہ ناول ''مکان'' میں نیرا کا کردار ہم ایسی آب و تاب کے ساتھ دیکھتے ہیں کہ گویا وہ عالمی ادب میں عورت کے ارتقا کا سب سے عمدہ نمونہ بن گیا ہے۔

بلاشبہ تانیثیت کی تحریک عورت کو اپنے خول سے باہر نکلنے، اپنے وجود کو پہچاننے، زندگی جینے کے بہتر اصول و طریقے اختیار کرنے اور عقل و عمل کی بنا پر زندگی کے ہر شعبہ حیات میں اسے اپنی موجودگی کا احساس دلا کر جس مثالی کردار کے روپ میں دیکھنا چاہتی تھی وہ مثالی کردار اردو ادب میں ۱۹۸۹ء میں نیرا کے روپ میں ہمارے سامنے آجاتا ہے۔ غسل خانے میں نہانے کے دوران جب باہر سے کوئی چٹخنی چڑھا دیتا ہے تو اس حماقت پر نیرا کے غصے اور سوال کرنے پر اسے ڈنڈے سے مار کر شدید زخمی کیا جاتا ہے۔ اس واقعے کی شکایت لے کر وہ تھانے جاتی ہے مگر وہاں رو کر اور بلک کر پولیس والوں سے رحم کی بھیک نہیں مانگتی بلکہ غیر ضروری کاموں میں ان کی مشغولیت اور ان کی دیگر غیر ضروری حرکات کو دیکھ کر نیرا کے اندر اس بات کو جاننے کا تجسس بڑھ جاتا ہے کہ کیا پولیس والے اسے انتظار کروا رہے ہیں یا وہ خود ہی اپنی شکایت درج کرنے کے لئے وہاں رکی انتظار کر رہی ہے۔ اس تعلق سے یہ اقتباس دیکھئے:

''میں انتظار کر رہی ہوں یا وہ انتظار کروا رہا ہے؟ میں یہاں کیوں ہوں؟ تاخیر ہونے کے باوجود یہاں کیوں رکی ہوئی ہوں؟ اور یہ میری طرف توجہ کیوں نہیں دے رہا ہے؟ اس لئے کہ وہ جانتا ہے کہ مجھے اس کی مدد کی ضرورت ہے اور اسے یقین ہے کہ میں اس لئے اس کا مجبوراً انتظار کروں گی کہ میرے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں اور وہ مجھ سے جتنی دیر تک چاہے انتظار کروا سکتا ہے اور پھر جیسے یکا یک ہی کوئی بات اس کی سمجھ میں آگئی۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔''(۹)

نیرا اپنی ذہانت سے جلد ہی سمجھ جاتی ہے کہ تھانے میں بیٹھا ہر پولیس والا اسے تھکا کر اس کے حوصلے کو توڑنا چاہتا ہے اور ٹوٹنا نیرا کو منظور نہیں۔ اسی لئے بنا شکایت لکھوائے وہ تھانے سے اٹھ آتی ہے۔ نیرا کی یہ حرکت نیر کے ساتھ ساتھ ایس۔ ایچ۔ او کو بھی جھٹکا دے جاتی ہے، کیوں کہ بنا رپورٹ لکھوائے آج پہلی بار کوئی لڑکی تھانے سے چلی گئی تھی۔ کمار اور پولیس دونوں کا ماننا تھا کہ نیرا ایک ناتجربہ کار لڑکی ہے اور چھوٹے سے الاؤ کی روشنی میں زندگی بسر کرنے والی یہ لڑکی لوہے کی چوٹ برداشت نہیں کر پائے گی اور وہ اپنے مقصد میں آسانی سے کامیاب ہو جائیں گے، مگر صرف نیرا کے مکان کو قیمتی سمجھنے والے لوگ آج پہلی بار مکان مالکن کی اہمیت سے واقف ہوئے۔ آج پہلی بار نیرا کا وجود ان سب کو متاثر کر گیا۔ پولیس کو اپنا محافظ سمجھ کر ہر شخص اپنی شکایت لے ان کے پاس جاتا ہے کہ وہاں سے مدد ملے گی، مگر یہاں چند روپیوں کی خاطر ایک یتیم لڑکی کو اس کے اپنے ہی گھر سے بے دخل کرنے کی سازش میں پولیس اپنا کلیدی رول نبھانے کا وعدہ کرتی ہے۔ اس ناول میں پیغام آفاقی نے پولیس کی گھناؤنی حقیقت کو چابک دستی سے برہنہ کیا ہے۔

نیرا کی یہ حرکت انسپکٹر نیر سے برداشت نہیں ہوئی۔ اس کے احتجاج سے نیر کے دل میں کچوکے لگتے ہیں، لیکن وہ ہار نہیں مانتا اور اس بار بھی بھرپور اعتماد کے ساتھ کمار سے کہتا ہے:

''یہ اپنے انداز کی ایک الگ ہی لڑکی ہے، ہر لڑکی اپنے انداز کی الگ ہی ہوتی ہے اور اپنے کو الگ ہی انداز کی سمجھتی ہے، لیکن اب مجھے بھی دلچسپی ہے کہ میں اس لڑکی کو ایک مخصوص خوبصورتی سے ہینڈل کر کے انچارج کو اور یہاں کے پورے عملے کو دکھاؤں کہ ہمیں کسی انوکھی

PDF Compressor Free Version

صورت حال میں کیسے کام چاہئے اور یہ کہ میں اس لڑکی کو کس خوبصورتی سے ہینڈل کرتا ہوں۔ آپ دیکھئے تو رفتہ رفتہ تھانے اور کورٹ بھگاتے بھگاتے اور قدم قدم پر اسمارٹنس کے استعمال کا موقع دیتے دیتے اور ساتھ ہی ساتھ چابک دستی سے اس کے اوپر دباؤ بڑھاتے بڑھاتے میں اس کے پرس کے پیسے اور آنکھوں کی جھجک سب کچھ چھین لوں گا اور پھر وہ دن آئیں گے کہ ہماری ہر چوٹ کو وہ اپنی دونوں ٹانگوں کے بیچ روکے گی اور اس خوش گمانی میں رہے گی کہ وہ بہادری سے ہمارا مقابلہ کر رہی ہے اور اسے یہ پتہ بھی نہیں رہے گا کہ وہ وہاں جا رہی ہے اور ان لوگوں سے مدد لے رہی ہے جہاں ہم چاہتے ہیں، ہم ہی ایک طرف سے اسے دبائیں گے اور ہم ہی دوسری طرف سے اسے پیار سے پکاریں گے اور اسے سہارا دیں گے۔ وہ ہماری آغوش میں ہمیں سے پوری یکسوئی اور دلجوئی سے جنگ میں مشغول نظر آئے گی اور خوش گمانی میں مبتلا رہے گی کہ وہ بہت بہادری سے لڑ رہی ہے اور پھر ہم اس کو سراہتے ہوئے انعام کے طور پر اس کو مقدمہ لڑنے کے لئے سکے بھی دیں گے اور دوسروں سے بھی دلوائیں گے اور تب اسے پتہ چلے گا کہ وہ جنگ لڑتے لڑتے کہاں پہنچی ہے اور پھر وہ خاموشی سے ایک دن یہ بھی محسوس کر لے گی کہ یہ جنگ اس کا پیشہ بن چکا ہے اور اس پیشے کی دنیا میں وہ مشہور و مقبول ہو چکی ہے اور وہ جان جائے گی کہ اس کو اب یہ جنگ اس وقت تک لڑنا ہی ہے جب تک اس کے جسم میں کوشش کی آخری کرن باقی ہے کہ اس سے پہلے جنگ کا یہ محاذ ختم ہو ہی نہیں سکتا۔ سمجھے؟'' (۱۰)

مندرجہ بالا اقتباس مرد اساس معاشرے کی عورتوں سے متعلق ذہنیت کی بہترین عکاسی کرتا ہے۔ انسپکٹر نیر یہاں پورے پدرسری سماج کی سوچ کی نمائندگی کرتا ہے۔ ایک عورت کے ساتھ مرد اساس معاشرہ جس طریقے کا سب سے زیادہ استعمال کرنا چاہتا ہے۔ مذکورہ اقتباس میں ناول نگار نے بے باکی سے اس کا خلاصہ کیا ہے۔ نیر جیسے لوگوں ہی کی وجہ سے نیرا جیسی ہزاروں معصوم لڑکیاں کال گرلز بن جاتی ہیں، مگر نیرا جدید دور کی ایک تعلیم یافتہ، ذہین اور باشعور لڑکی ہے وہ اپنی بے باکی سے نیر کے گندے ارادوں کو کسی بھی طرح کامیاب ہونے نہیں دیتی۔ جب وہ اپنے گندے ارادوں کو انجام دینے کے لئے نیرا کو اس کی بات تفصیل سے سننے کے لئے اپنے گھر آنے پر مدعو کرتا ہے اور نیرا کے وہاں جانے پر نشے میں دھت اس کے ساتھ بدتمیزی کرنے لگتا ہے تو نیرا ذرا بھی نہیں بہکتی اور نہ ہی اس کی مدد حاصل کرنے کی غرض سے وہ خود کو اس کے سپرد کرتی ہے، بلکہ وہ نہایت سرد مہری اختیار کر لیتی ہے اور اس کی یہ سرد مہری ہی نیر کو اس کی نسوانیت مجروح کرنے سے روک لیتی ہے۔ نیر کا خیال تھا کہ نیرا اس کے ڈر اور اپنے کام کے لالچ میں خود کو اس کے سپرد کرے گی، لیکن وہ اس کے خیال کو غلط ثابت کر دیتی ہے۔ حالاں کہ ذہانت اور استقلال سے اپنے تشخص کی جنگ لڑ رہی نیرا، کمار کی رچائی قوی سازشوں سے کبھی کمزور بھی پڑ جاتی ہے، مگر ٹوٹتی نہیں ہے۔ پدرانہ سماج کی ہمہ گیر سازشیں نیرا کے اندر چھپی تخلیقی قوتوں کو جلا بخشتی ہیں۔ ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی نیرا کے کردار کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار یوں کرتے ہیں:

> ''کمار اور نیرا کے مابین جدوجہد اور احتجاجی رویوں کی سرگزشت کا نام 'مکان' ہے۔ اس جدوجہد میں اپنے ایقان، صداقت، موت سے بے خوفی اور استقامت کے ذریعے نیرا کامیاب ہو جاتی ہے۔ غالباً پہلی بار کسی ناول نگار نے ایک ایسا کردار دیا ہے جو ہر قوت کے مقابلے میں زیادہ قوت ور نکلا۔ بالخصوص نسوانی کردار کو اتنی مضبوطی اور استقلال کے رنگ میں رنگ کر شاید پہلی بار پیش کیا ہے۔'' (۱۱)

نیرا کا کردار واقعی اردو ناول کا پہلا مضبوط کردار ہے۔ اس کردار کی تشکیل میں آفاقی نے غیر معمولی غور و فکر سے کام لیا ہے اور ساتھ ہی اس کردار میں ایک قسم کا فولادی جوہر بھر دیا ہے کہ وہ ان تمام مراحل سے کامیابی کے ساتھ گزر کر فتح پا لیتی ہے۔ دوسری طرف کمار اپنی اسکیم کے

PDF Compressor Free Version

مطابق نیرا کے گھر محلے کے لوگ بھیج دیتا ہے جو نیرا کو طرح طرح کی گالیاں دیتے ہیں۔ گھر میں گھسی بھیڑ کو دیکھ کر نیرا کو حیرت ہوتی ہے کہ اس کے عورت ہونے کی بنا پر کوئی بھی اور کبھی بھی اس کے گھر میں گھسنے کی ہمت کرسکتا ہے، لیکن اب اس کے اندر کا ڈر، مایوسی، خوف سب دھیرے دھیرے مٹتا چلا جارہا تھا اور اس کے اندر کمار سے لڑنے کی بے پناہ قوت اور جرات آچکی تھی۔ نیرا نہ صرف حوصلہ مند بن چکی تھی بلکہ وہ بیباکی سے سارے حدود توڑتی ہوئی محلے والوں کے سنگ آئے انسپکٹر نیر سے کہتی ہے:

''آپ مجھے کال گرل بنانا چاہتے ہیں، اگر مجھے بکھر کر دوبارہ اپنے کو سمیٹنے کے لئے کال گرل بھی بننا پڑے تو میں بنوں گی، لیکن میں بکھروں گی نہیں۔ میں نے اپنے کو اپنی طاقت سے باقی رکھنے کا تہیہ کرلیا ہے اور اس کے ساتھ ہی میں آپ کو یاد رکھوں گی، آپ کی اس وردی اور اس عہدے کو نہیں بلکہ آپ کے اندر کے اس انسان کو یاد رکھوں گی جو ایک جانور کی طرح میرے پیچھے گھوم رہا ہے۔ آپ کے اندر ایک کمینہ انسان ہے، ذلیل، کتا۔ مسٹر نیر میں جانتی ہوں یہ ساری پوچھ تاچھ ایک بکواس، ایک غیر قانونی حرکت اور ایک ڈرامہ ہے۔'' (۱۲)

اوپر دیے گئے اقتباس میں نیرا کھلے عام کہتی ہے کہ وہ ضرورت پڑنے پر کال گرل بھی بنے گی، لیکن پھر بھی اپنے مقصد کو نہیں بھولے گی، حالانکہ ناول میں کہیں بھی ایسا کوئی واقعہ نہیں ملتا جہاں نیرا اپنے فائدے کے لئے اپنے جسم کو استعمال کرنے کا ارادہ رکھتی ہو، پھر نیرا کال گرل کا لفظ کن معنوں میں استعمال کرتی ہے؟ یہ بات غور طلب ہے۔ شاید نیرا یہ کہنا چاہتی ہے کہ نیرا اس کی شرافت کو اس کی کمزوری نہ سمجھے، اسی لئے وہ نیر کو احساس دلانا چاہتی ہے کہ وہ غیر اخلاقی سطح پر اترنے پر بھی قادر ہے اور اس کی یہ قدرت نیر کے لئے ایک ایسی چمکتی ہوئی تلوار ہے جو اسے ذبح کرسکتی ہے۔ یہاں نیرا اپنی اس لڑائی میں کسی خیال اور اس کے اظہار کے استعمال کو برا نہیں سمجھتی۔

نیرا کا کہنا ہے کہ وہ ضرورت پڑنے پر کال گرل بھی بنے گی، دراصل یہاں پیغام آفاقی کا یہ پورے سماج کے لئے ایک پیغام ہے کہ عورت کی حیا اور اس کی چوڑیاں اس کی شخصیت کو باندھنے والی زنجیریں نہیں بلکہ ایسے زیور ہیں جو اگر حق کی لڑائی کی راہ میں حائل ہوجائیں تو انہیں اتار کر الگ بھی کیا جاسکتا ہے، کیوں کہ کوئی بھی انسان چاہے وہ مرد ہو یا عورت وہ اپنی شرافت کا قیدی نہیں ہوتا اور جو لوگ ان کی شرافت کو ان کی کمزوری سمجھ کر، ان پر ظلم و جبر کرکے ان کو ایذا دیتے ہیں، انہیں پیغام آفاقی اس حقیقت سے آشنا کراتے ہیں کہ ضرورت پڑنے پر ہر شریف انسان اپنی شرافت کا لبادہ اتارنے کی ہمت رکھتا ہے۔

اس لڑائی کو جاری رکھنے کی ہمت نیرا کو اپنے اندر کے ہمزاد سے بھی ملتی ہے، جو وقت وقت پر نیرا کی سوچ پر سوار ہوکر اسے صحیح راستہ دکھاتا ہے۔ اسی ہمزاد کی بدولت وہ کمار کی قوی چالوں سے لمحہ لمحہ کمزور پڑنے کے بعد بھی نہیں ٹوٹتی، بلکہ جب بھی اس کا اعتماد بکھرنے سا لگتا ہے تو یہی ہمزاد اسے اور اس کے اعتماد کو بکھرنے سے بچالیتا ہے۔ زمانے کے نشیب و فراز سے خوفزدہ ہوکر کمار اور دوسرے لوگوں سے ملی اذیتوں کے بوجھ تلے نیرا کو دبنے سے بھی اس کا ہمزاد ہی بچاتا ہے۔ اس ضمن میں شعیب رضا لکھتے ہیں:

''پورے ناول پر نیرا کا مکمل قبضہ ہے، لیکن نیرا کے علاوہ ایک اور بہت اہم کردار اس ناول کے اندر موجود ہے جس کا نہ تو کوئی نام ہے اور نہ ہی وہ کبھی ناول کے صفحات پر نظر آتا ہے اور وہ ہے نیرا کا ہمزاد جو اسے ایک میڈیکل کی کمسن طالبہ سے باوقار اور مضبوط کردار بنا دیتا ہے۔ پیغام آفاقی نے نیرا کے کردار کو تراشتے وقت اس بات کا خاص خیال رکھا ہے کہ ناول کے کسی بھی حصہ میں نیرا ایک معمولی لڑکی نظر نہ آئے اور اسی لئے ناول کے شروع ہوتے ہی نیرا اور اس کی ماں کی گفتگو سے نیرا کا مضبوط کردار مستحکم ہوجاتا ہے۔'' (۱۳)

ناول میں بہت سے ایسے مراحل بھی آتے ہیں جب قاری کو نیرا ٹوٹ کر بکھرنے والی محسوس ہونے لگتی ہے، لیکن پھر اچانک اس کے اندر سمندر میں پوشیدہ چٹان کی مانند کوئی طاقت ابھر آتی ہے جس سے ٹکرا کر اس کے

PDF Compressor Free Version

وسوسے اور کمزوریاں چور ہو جاتی ہے اور وہ اپنے اندر بے پناہ طاقت محسوس کرنے کے بعد مضبوط سے مضبوط تر بن جاتی ہے اور اس کے مضبوط کردار کو دیکھ کر وہ ساری طاقتیں چاہے کمار ہو، انسپکٹر نیر ہو، عدالت ہو، یا وکیل سبھی حملہ آور ہونے کے باوجود بھی اس کو توڑنے میں کامیاب نہیں ہو پاتے۔ نیرا کے اندر موجود مزاحمت اس پر ہو رہے حملوں کو مسمار کر دیتی ہے اور پھر پوری خود اعتمادی کے ساتھ وہ آگے بڑھ جاتی ہے اور کہتی ہے:

''تم سمجھتے ہو کہ میں ایک کمزور لڑکی ہوں؟ میں عورت ہوں، میں ایک سمندر ہوں کہ جس میں پورا پہاڑ غرقاب ہو سکتا ہے، لیکن میں جو کچھ اپنے اندر سہتی ہوں اس سے نئی چیزیں جنم لیتی ہیں۔ میں کوکھ ہوں، میرے اندر جو عکس پیدا ہوتا ہے وہ محض خیال نہیں ہوتا۔'' (۱۴)

یہاں نیرا نے اپنی تانیثی ساخت کے عرفان کا اظہار کیا ہے اور اس میتھ کو توڑا ہے کہ عورت کی جسمانی ساخت کمزوری کی علامت ہے۔ مستند نقاد خورشید احمد کا اس ناول کو ''نیرائیت'' کہنا بالکل صحیح ہے کیوں کہ نیرا تنہا ہی اس استحصال بھرے سماج میں جس ہنرمندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی جنگ لڑتی ہے وہ یقیناً چونکا دیتا ہے۔ اس طرح نیرا کے کردار کو عورت کے ارتقا کا سب سے پہلا اور نہایت عمدہ نمونہ کہا جا سکتا ہے۔ تانیثیت کی تحریک نے عورتوں کو نابرابری، محکومیت، تابع داری اور خاص کر مرد اساس معاشرہ کی ادارہ بندی کے تمام تر نظریات کو جھٹلا کر انہیں جڑ سے اکھاڑ پھینک دینے پر مدعو کیا۔ تانیثیت کے اس پرچم کو اردو ادب میں لہرانے میں ناول ''مکان'' اہم رول ادا کرتا ہے کیونکہ اس ناول میں عورت کی جدوجہد اپنی شخصیت اور اپنے حقوق کے تحفظ و بقا اور اس کی شدید مخالفت میں ہر قدم پر مرد کی طرف سے حائد کئے گئے قدغن کی ساخت شکنی ہے۔ ''تاریخ اردو ادب'' میں وہاب اشرفی رقمطراز ہیں:

''مکان میں ایک شخص کمار ہے۔ یہ خاتون جو تنہا ہے اور اس کا کوئی مددگار نہیں، اسے وہ بے دخل کرنا چاہتا ہے۔ مردانہ بالادستی کے باوجود نیرا مسلسل اس سے ٹکراتی رہتی ہے۔ کچی عمر کو دیکھتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ سپر ڈال دے گی، لیکن وہ ہر محاذ پر انتہائی سنگین حالت میں ڈٹی رہتی ہے اسے پولیس اور تھانے کے معاملات سے بھی نبرد آزما ہونا پڑتا ہے، لیکن اس کا حوصلہ بلند سے بلند تر ہوتا جاتا ہے۔ سماج کی Peternal Society اس کی نسائیت کی کمزوریوں کو پہچانتے ہوئے ایسے عوامل سے گزارتی ہیں جہاں اسے شکست کھانا چاہئے تھا، لیکن حالات اسے خوف زدہ کرتے ہیں اور نہ پژمردہ۔ وہ جنسی استحصال کا شکار ہوتی ہے اور نہ اسے ہلاکت کا خوف ہوتا ہے۔ نتیجے میں وہ ایک آئیڈئل کردار بن جاتی ہے۔ اس ضمن میں اس کا تقابلی مطالعہ 'تلاش بہاراں' کی ہیروئن کنول ٹھاکر سے کیا جا سکتا ہے۔'' (۱۵)

نیرا مسلسل جدوجہد کر کے اپنے ذاتی حقوق کے لئے لڑتی رہتی ہے اور سماج کے ظلم و جبر کے آگے ہار نہ ماننے کا عزم کرتے ہوئے آگے بڑھ جاتی ہے۔ اپنے حق کی لڑائی کو لڑتے رہنے کا فیصلہ اسے جنونی بنا دیتا ہے اور دوسری طرف کمار اپنے ہاتھوں سے سب کچھ پھسلتا ہوا محسوس کرنے لگتا ہے، حالاں کہ نیرا کا مکان حاصل کرنے کے لئے اس نے بہت مضبوطی اور چالاکی سے ایک جامع اسکیم تیار کی تھی۔

نیرا کو تھانے دوڑانا، گھر میں اس کے ساتھ مار پیٹ کرنا، جھوٹے مقدموں میں پھنسوانا، گھر کے پھاٹک کے ستون پر لگے نیرا کے باپ کے نام کی تختی کی جگہ اپنے نام کی تختی لگوانا، نیرا کے گھر آئے مہمانوں کو پولیس کے ذریعہ سے دھمکانا یا ان پر اپنے پالتو کتے کو دوڑانا، عدالت میں اس پر ایسے الزامات لگانا کہ شرم سے دوبارہ عدالت کا رخ نہ کرے، نیرا کے منگیتر کو اس سے الگ کرنا، غنڈوں کے ذریعے نیرا کو ڈرانا وغیرہ۔ غرض یہ سب نیرا کا مکان ہتھیانے کی اسکیم میں شامل تھا، مگر نیرا کا عزم کمار کی جامع اور نتیجہ خیز دکھنے والی اسکیم کو بے معنی بنا کے رکھ دیتا ہے۔ وہ کمزور ہونے کے بجائے مضبوط اور نڈر بنتی چلی جا رہی ہے اور ایک دن عدالت میں کمار سے روبرو ہو کر کہتی ہے کہ وہ اس کے مکان کو چھوڑ کر جانے کے بعد بھی مقدموں کو تب تک ختم نہیں کرے گی جب تک اس کی طرف سے کئے گئے جھوٹے مقدموں پر خرچ کئے گئے

PDF Compressor Free Version

پیسے وہ نیرا کو واپس نہ کردے۔

نیرا کا عزم دیکھتے ہوئے آخر کار انسپکٹر نیر، اشوک، عدالت سبھی کمار کے ہاتھ سے چھوٹتے گئے، پیسوں کے بل پر سب کچھ حاصل کرنے کا اس کا خیال غلط ثابت ہوا اور اس خیال کو غلط ثابت کرنے والی وہی لڑکی تھی جسے وہ تنہا سمجھ کر ایک پل میں اپنے راستے سے ہٹانے کا خواب دیکھ چکا تھا۔ وہ نیرا کے مستحکم ارادوں کو دیکھ کر مایوس ہو جاتا ہے اور ہار مان کر اشوک سے کہتا ہے:

''میں یہ مکان چھوڑ دوں گا، لیکن مجھے اس بات کی اتنی تکلیف نہیں رہے گی، جتنی اس بات کی کہ انہیں حقائق نے مجھے چوٹ پہنچائی جن پر میں نے بھروسہ کیا۔''(۱۶)

اس طرح کمار کا غرور چور ہو کر بکھر گیا اور نیرا کے اندر پیدا ہوئے عزم نے کمار کے سارے وسیلوں کو ناکام کر دیا اور اس نے اپنا مکان حاصل کر لیا۔

پیغام آفاقی نے نیرا کے کردار کی وساطت سے مردانہ بالادستی سے بغاوت کی آگ میں عورت کو جھلستے ہوئے اور پھر اپنے حق کو حاصل کرتے ہوئے دکھایا ہے۔ اسے اس کے مقصد سے دور کرنے کے لئے اس کی نفسیاتی جنسی خواہشات کو جگانے کے مختلف طریقے بھی اپنائے جاتے ہیں، جو عورت کو زیر کرنے کا مرد کے پاس بہترین ہتھیار رہا ہے، مگر مردانہ سماج کی انتھاہ کوششوں کے باوجود بھی وہ نیرا کے وجود کا استحصال کرنے میں ناکام ہوتے ہیں۔

نیرا دور حاضر کی خواتین کے لئے ایک مشعل کی مانند ابھرتی ہے، جو خود کفالت اور ترقی کا منبع ہے۔ ہمارے سماج کے کچھ تنگ نظر لوگ لڑکیوں کو تعلیمی اور کاروباری اداروں سے دور رکھتے ہیں کہ کہیں ان کا کردار مجروح نہ ہو جائے اور ظلم و جبر کی چکی میں ہمیشہ سے پستی آرہی عورت اخلاقیات کے حدود کو سماج کے ڈر سے پار نہیں کر پاتی، لیکن عورت صرف گھر کے باہر نہ نکلنے سے ہی محفوظ کہاں ہے؟ پدرانہ سماج تو اس کے گھر میں گھس کر اس پر وار کرنے لگتا ہے، جس کی ایک مثال پیغام آفاقی نے ناول ''مکان'' کے ذریعے پیش کی ہے، ساتھ ہی عصر حاضر میں ہر شعبہ حیات میں ترقی کے ساتھ ساتھ عورت کو ترقی کا بہترین پیغام بھی دیا ہے اور ان نیراؤں کو ہمت اور حوصلے کا پاٹ پڑھایا ہے جن کے ساتھ پدرانہ سماج نہ صرف گھر کے باہر ظلم کرتا ہے بلکہ گھر میں گھس کر ان کی تنہائی اور نسوانیت کو مدنظر رکھ کر ان کا حق مارنے کی مسلسل کوششیں کرتا ہے۔

حواشی

(۱) ایک خط، ظفر پیامی، ۱۸، اگست ۱۹۸۹ء

(۲) ایک خط، ساجد اعظم کیم اکتوبر بروز جمعرات ۱۹۹۰ء

(۳) مابعد جدیدیت: مضمرات و ممکنات، وہاب اشرفی، اشاعت سوم ۲۰۰۷ء، پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ص ۲۷۵

(۴) ادبی تخلیق اور ناول، ڈاکٹر احسان فاروقی، ص ۳۸، اشاعت اول ۱۹۶۲ء، مکتبہ اسلوب مسلم لیگ کوارٹرز ناظم آباد کراچی

(۵و۶) مکان، پیغام آفاقی، ناشر رضیہ سلطانہ، نام فکشن اکیڈمی، جامعہ نگر، دہلی، ۱۹۸۹ء، ص ۶ و ص ۸

(۷) اردو ناول کا معیار اور مکان، ڈاکٹر مولا بخش، مشمولہ مکان، پیغام آفاقی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۰۴ء، ص ۶۲

(۸) میں اور مافیا کی جہات، پیغام آفاقی، مشمولہ مافیا، پیغام آفاقی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۰۲ء، ص ۱۴

(۹) مکان، پیغام آفاقی، ناشر رضیہ سلطانہ، نام فکشن اکیڈمی، جامعہ نگر، دہلی، ۱۹۸۹ء، ص ۵۳ و ص ۵۴

(۱۰) مکان، پیغام آفاقی، ناشر رضیہ سلطانہ، نام فکشن اکیڈمی جامعہ نگر، دہلی، ۱۹۸۹ء، ص ۶۵ و ص ۶۶

(۱۱) اردو ناول کے اسالیب، ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی، پبلشر تخلیق کار پبلشرز، ۲۰۰۶ء، ص ۳۰۵

(۱۲) مکان، پیغام آفاقی، ناشر رضیہ سلطانہ، فکشن اکیڈمی، دہلی، ۱۹۸۹ء، ص ۹۳

(۱۳) مکان پر تبصرہ، شعیب رضا فاطمی، مشمولہ یہ صبح، سہ ماہی، دہلی، ایڈیٹر شعیب رضا فاطمی، ۱۹۹۸ء

(۱۴) مکان، پیغام آفاقی، ناشر رضیہ سلطانہ، فکشن اکیڈمی، دہلی، ۱۹۸۹ء، ص ۷۷

(۱۵) تاریخ اردو ادب ابتدا سے ۲۰۰۰ء تک جلد سوم، وہاب اشرفی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۰۷ء، ص ۱۳۱۷

(۱۶) مکان، پیغام آفاقی، ناشر رضیہ سلطانہ، فکشن اکیڈمی، دہلی، ۱۹۸۹ء، ص ۳۹۲

PDF Compressor Free Version

نشاط اختر
ریسرچ اسکالر، پٹنہ یونیورسٹی، پٹنہ

ناول ''پلیتہ'': ایک مطالعہ

پیغام آفاقی کی شہرت ان کے دو ناول ''مکان'' اور ''پلیتہ'' سے ہے۔ پہلا الذکر ناول اردو اکادمی دہلی انتظامیہ دہلی کے جزوی مالی تعاون سے ۱۹۸۹ء میں شائع ہوا۔ چار سو صفحات پر مشتمل اس ناول کا انتساب ناول نگار کی نصف بہتر ''رضیہ سلطانہ کے خلوص اور تعلق کے نام'' ہے۔ بتیس ابواب پر پھیلے ہوئے اس ناول کے متن کا پہلا صفحہ ''آنکھ'' اور ''قدموں'' کے نشانات سمیت ایک تجریدی، مگر بڑے ہی بامعنی آرٹ سے مزین ہے۔ مکان سے نکلتا ہوا قدم، اس کے اردگرد گھومتے ہوئے آنکھ کے حلقے تک پہنچتا ہے۔ ناول کے پہلے اندرونی فلیپ پر ''ایک قاری کی ڈائری سے'' جو اقتباس ہے، وہ محض اردو رسم الخط میں سہی، لیکن بڑی اہمیت کا حامل ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ:

> ''پیغام آفاقی کے لکھنے کی شیلی کا آدھار مکھتیہ ہمارے آس پاس، ہمارے ساتھ گھٹنے والی وہ چھوٹی موٹی گھٹنائیں ہیں، جن سے ہم انجان رہتے ہیں، کنتو وہ اپنے آپ میں بہت مہتو پورن ہوتی ہیں۔''

اس میں دو رائے نہیں ہو سکتی کہ ناول ''مکان'' مجموعی طور پر ایک شعور افزا اور بصیرت نواز ناول ہے، جو قدموں کی مختلف جہات کو تازہ بصیرت و بصارت سے پہچاننے اور اسے عام کرنے کا پیغام دیتا ہے۔

ناول کے آخری اندرونی فلیپ پر ''نام فکشن اکیڈمی'' کا جو اقتباس ہے اس کی آخری سطریں بھی ہمیں پیغام آفاقی کی فکشن نگاری کے مزاج و اختصاص کو سمجھنے میں مدد دیتی ہیں۔ بلاشبہ:

> ''زندگی کی منجدھار کے بیچ رہنے والے سیاہ سفید سے یکساں طور پر واقف اس مصنف کی تخلیقات جدید ترین حسیت کی آئینہ دار ہیں۔''

اور یہ بھی کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ ان کے افسانوں کی اہمیت اپنی جگہ، لیکن ''مکان'' جیسے ناول کے توسط سے ان کی فکری و فنی صلاحیت اور دانشورانہ ژرف بینی اپنی حیرت انگیز شعاعوں کے ساتھ ہمارے سامنے آجاتی ہے۔

ناول ''مکان'' کے آخری سرورق پر مصنف کی تصویر کے ساتھ ''دور درشن سے نشر'' اس کا یہ بیان درج ہے کہ:

> ''اس دور میں جہاں جغرافیائی طور پر دنیا بہت چھوٹی ہوئی ہے، وہیں گوناگوں وسعتوں کی وجہ سے یہ بے حد دشوار اور پیچیدہ بھی ہوگئی ہے اور اس پورے نظام میں ہر انسان کہیں نہ کہیں اٹک کر رہ گیا ہے۔ یہ الجھنیں بیحد دقیق ہیں اور یہ پیچیدگیاں لامتناہی نظر آتی ہیں۔ ان کے روبرو نظریں الجھ کر رہ گئی ہیں، اس سے انسان کا حوصلہ پست ہو رہا ہے اور وہ اپنے کو انتہائی کمزور محسوس کرنے لگا ہے۔ میں ان الجھنوں اور پیچیدگیوں کے اندر گھس کر ان کے تانے بانے کو دیکھتا ہوں اور جس نقطے پر پہنچنے کے بعد ان کا الجھاؤ ختم ہونے لگتا ہے، اس نقطے کو اور اس کے ادراک سے جو قوت حاصل ہوتی ہے اس کی کیفیت کو پیش کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ یہی وہ منظر ہے جو میری دلچسپیوں کا مرکز ہے۔''

پیغام آفاقی کا یہ دعویٰ اگر کوئی تعلی ہے تو ہمیں کہنا چاہیے کہ ناول ''مکان'' کی تخلیق اس بظاہر مبالغہ آمیز تعلی کو اظہار حقیقت بنا دیتی ہے۔ بلاشبہ جو منظر فنکار کی دلچسپیوں کا مرکز ہے، اسے بڑی چابکدستی کے ساتھ اس نے اس ناول کے توسط سے دیکھنے اور دکھانے کا فریضہ انجام دیا ہے۔ اس ناول میں طوالت اور زبان و بیان کی بعض کمزوریوں کا

PDF Compressor Free Version

ذکر، ناقدین کے نوک قلم پر آتا رہتا ہے، لیکن سچی بات یہ ہے کہ یہ بھی بجائے خود اس نظام ہی کا ایک عکس ہے جو الجھنوں کے حصار میں گھرا ہوا ہے اور اپنے وابستگان کو بھی نت نئے اور عجیب حوصلہ شکن طریقوں سے اپنے حصار میں لے رہا ہے۔

پیغام آفاقی کا دوسرا ناول ''پلیتہ'' جو چھ سو صفحات پر مشتمل ہے، ۲۰۱۱ء میں منظر عام پر آیا۔ اس طویل ناول کا انتساب ''ہارودی سرنگوں کے نام'' ہے۔ میرا اصل موضوع اگرچہ پیغام آفاقی کا یہی ناول ''پلیتہ'' ہے، مگر میں نے دانستہ طور پر آفاقی کے پہلے ناول کی بات، بصورت تمہید ذرا تفصیل سے لکھی ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ پیغام آفاقی کے ناول ''پلیتہ'' میں اصل متن کے علاوہ، اُس قسم کی کوئی تعارفی تحریر نہیں ہے جو ''مکان'' میں شامل ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ''پلیتہ'' کو پڑھنے اور سمجھنے کے لئے ان تحریروں سے ہی ضروری مدد لینی ہوگی جو ''مکان'' کے ساتھ ہیں اور حقیقت بھی یہی ہے کہ ''مکان'' کی اشاعت کے تقریباً دو دہائی کے بعد سامنے آنے والے، پندرہ ابواب پر مشتمل اس ناول کو ان علمی و فکری اور نفسیاتی نکات سے الگ کر کے دیکھا ہی نہیں جا سکتا ہے جو ''مکان'' کے فلیپ اور آخری سرورق پر موجود ہیں۔ وہاں پیغام آفاقی کے قاری کا جو تاثر ہے وہی ''پلیتہ'' پر بھی صادق آتا ہے اور اپنے تعلق سے وہاں پیغام نے جو باتیں کہی ہیں، وہ اس ناول کو بھی سمجھنے میں مددگار بنتی ہیں۔

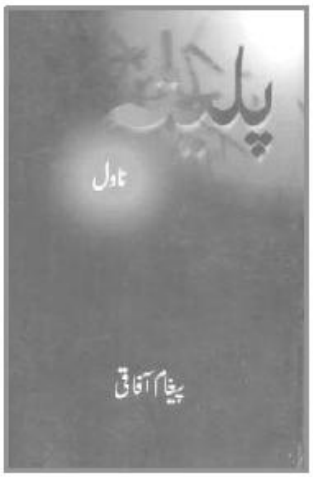

ناول ''پلیتہ'' کو ''مکان'' جیسی شہرت و مقبولیت ملی ہو یا نہ ملی ہو اور اسے ناقدین نے متفقہ طور پر ایک عظیم ناول قرار دیا ہو یا نہ دیا ہو، لیکن اتنی بات طے ہے کہ اس ناول میں بھی پیغام آفاقی نے ان مناظر اور ان نظری مخصصات اور نقاط کو بہت اچھی طرح دیکھا اور دکھایا ہے جو اس کی ''دلچسپیوں کا مرکز'' ہیں۔ آج کے دور میں جو بدامنی، بدنظمی، اخلاقی و فکری کساد بازاری، تلبیسی روش، لاقانونیت اور جو سیاسی سودے بازی یہاں سے وہاں تک پھیلی ہوئی ہے، اسے ''پلیتہ'' میں بڑی فنی مہارت کے ساتھ آئینہ کر دیا گیا ہے اور خاص فکری و فلسفیانہ استحکام کے ساتھ انہیں دور کرنے کی راہیں بھی دکھائی گئی ہیں۔ ڈاکٹر حقانی القاسمی نے اس ناول پر اظہار خیال کرتے ہوئے بالکل درست لکھا ہے کہ:

> ''یہ ناول عظیم ہے یا نہیں، یہ تو وقت طے کرے گا، البتہ جہاں تک اس ناول کے موضوع کا تعلق ہے تو اس کا کینوس بہت ہی وسیع ہے۔ یہ ملٹی ڈائی منشنل ناول اور زمانی و مکانی تعینات سے ماورا ہے جو بڑی ریاضت اور ریسرچ کے بعد تحریر کیا گیا ہے اور نکتہ کی بات تو یہ ہے کہ کالا پانی پر کتابیں تو لکھی گئی ہیں، مگر اس نقطہ پر کسی کی نظر نہیں ٹھہری جو نقطہ ناول نگار نے دریافت کیا ہے اور یہ کہ ایک خلاق ذہن ہی اس طرح کی اختراع کر سکتا ہے کہ نگاہ شوق سے ہی نئے منطقے روشن ہوتے ہیں۔''

گویا اس ناول کی عظمتوں کو پوری طرح سمجھنے کے لئے ایک خاص شعور و ادراک کا ہونا لازمی ہے۔ اس ناول میں پیغام آفاقی نے ایک خاص فکری وژن کے ساتھ ''کالا پانی'' کو محور بنایا ہے اور اسی محور و مرکز کے سہارے قدیم زمانے سے لے کر آج تک کے تمام انسانی مسائل کا منطقی محاسبہ سامنے لا دیا ہے۔ حقانی القاسمی ہی کے لفظوں میں:

> ''کالا پانی دراصل جبر کا ایک استعارہ ہے اور یہی جبر پورے برصغیر ہی میں نہیں بلکہ پوری دنیا میں پھیلا ہوا ہے۔ 'پلیتہ' میں مرکزی کردار تو خالد سہیل ہے جو ایک سائیکو میشیا کی کیفیت سے دوچار ہے۔ اس کے ذہن کے اندر ایک جنگ کی سی کیفیت جاری رہتی ہے۔ کالا پانی کے تناظر میں وہ پوری دنیا کا جائزہ لیتا ہے اور یہ محسوس کرتا ہے کہ کالا پانی ایک تجارتی ذہنیت کی دین تھی، برطانوی تجارتی ذہن نے اسے تعمیر کیا تھا۔ وہاں برطانوی حکومت نہیں بلکہ تجارت تھی جس نے اپنے مفاد کے لئے ایک جیل خانہ تعمیر کیا تا کہ وہاں کے معصوم

PDF Compressor Free Version

قیدی کو اپنے تجارتی اغراض و مقاصد کے لئے استعمال کیا جائے۔ یہی وہ نکتہ ہے جس کا عرفان خالد سہیل کو ہوا۔ ناول نگار نے کالا پانی کے تمام دستاویزات اور وثائق کے حوالے سے یہ بات واضح کی ہے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی حکومت نہیں بلکہ ایک تجارت تھی اور برطانوی اقتدار ایک تاجرانہ پروجکٹ کا حصہ تھا۔''

یہ اقتباس قدرے طویل سہی، لیکن اس رخ سے ناول کی اہمیت کا احساس ضرور دلاتا ہے، جسے فکشن میں ہنرمندی اور خلاقانہ ذہنیت کے ساتھ، نئے اور اچھوتے زاویے سے تاریخی تجزیے کی شمولیت کہتے ہیں۔ اس ناول میں متنوع سلگتے ہوئے عصری موضوعات کو تاریخی تناظر میں سامنے لایا گیا ہے اور ایک سے بڑھ کر ایک ایسے ایسے اقتباسات سے یہاں قاری کا واسطہ پڑتا ہے جس کے فلسفیانہ رخ اور جس کی منطقیت اسے تادیر ورطۂ حیرت میں ڈال دیتی ہے اور بالکل ایسا لگتا ہے جیسے وہ کسی کہرے بھرے ماحول سے اچانک کھلی دھوپ میں آ گیا ہو۔ اس طرح ایک ناول کی بنت آسان نہیں سخت مشکل ہے اور ناول نگار سے ہر قدم پھونک پھونک کر اٹھانے یا قلم سے قرطاس پر ہر نقطہ ہزار غور و فکر کے بعد ڈالنے کا تقاضا کرتی ہے اور یہ کہنا شاید مبالغہ نہیں کہ پیغام آفاقی نے جو ذمہ داری خود اپنے سر لی ہے، اسے بڑی خوبی اور کامیابی سے سرانجام دیا ہے اور اس میں یقیناً ان کا وہ اسلوب ان کی سب سے زیادہ پشت پناہی کرتا رہا ہے جو سخن اور سلیقۂ سخن میں فطری اور انتخابی تال میل سے عبارت ہے۔ مشرف عالم ذوقی نے بالکل درست لکھا ہے کہ:

''اس ناول میں پیغام آفاقی نے نہ صرف اسلوب پر محنت کی ہے بلکہ ماضی اور حال کے تصادم سے ایک نئی بستی یا ایک نئی دنیا بھی آباد کرنے کی کوشش کی ہے اور اس دنیا میں ہر وہ مسئلہ ناول کا حصہ بنتا ہے جو ہمارے آج کے عہد سے وابستہ ہے۔ فیمینزم، مارکیٹ اکانومی، گلوبلائزیشن، کرپشن، انسانی و لسانی حقوق، کارپوریٹ، کلچر، ورلڈ وار یا ورلڈ وار کی طرف بڑھتے قدم، پولرائزیشن اور ان کے مابین حیات انسانی کے فلسفوں کی تلاش نہ صرف اس ناول کے مطالعہ کے لئے مجبور کرتی ہے بلکہ ایسے بنیادی مغالطوں سے بھی ہمیں باہر کا راستہ دکھاتی ہے کہ اردو ناول میں بڑے بڑے موضوعات شامل نہیں کئے جا رہے ہیں۔ پیغام نے آج کے عہد کی بدنظمی، لاقانونیت، بدامنی اور دیوالیہ پن کی جو تصویر ہمارے سامنے رکھی ہے، وہیں سے ایک نئے معاشرتی اور سیاسی نظام کا چہرہ بھی ابھر کر سامنے آتا ہے۔''

یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ پیغام آفاقی کا ناول ''پلیتہ'' بھی گویا کردار ہی کا ناول ہے یا پھر یہ کہا جائے کہ یہ ناول خالد سہیل کی داستان حیات ہے جو اگرچہ ''نوخیز شخصیت'' کا مالک تھا، لیکن اس کی شخصیت، خود اس کی زندگی میں پایۂ تکمیل تک نہیں پہونچ سکی۔ یہاں جس کتاب کا ذکر ہے وہ خالد سہیل کی موت کے بعد اس کے کمرے میں پائی گئی اس کی جستہ جستہ تحریروں کو جمع کر کے مرتب کی گئی تھی۔ ناول نگار نے اس کتاب کو ''عجیب و غریب'' کہا ہے جو ہر اگلے ایڈیشن کے ساتھ موٹی ہوتی جا رہی تھی۔ یہ اصل میں ایک بلیغ اشارہ ہے جو اس ناول کی ضخامت پر اٹھنے والے سوال کا پیشگی جواب مہیا کرتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ اعلیٰ اقدار کی پامالی کے بڑھتے ہوئے سلسلہ کا بھی ہمیں خاموش احساس دلا دیتا ہے۔ یہ شاید وہی سلسلہ ہے جو ''مکان'' سے ''پلیتہ'' تک پہنچا ہے۔

ناول نگار نے خالد کا شجرۂ نسب تین کرسی تک بیان کر دیا ہے یعنی اس کے والد شیخ عبدالرحمٰن، دادا خدا بخش اور پردادا میر علی۔ ہم جانتے ہیں کہ تین چار پیڑھی گزرتے گزرتے ایک صدی سے زیادہ کا زمانی فاصلہ آ جاتا ہے۔ اس طرح ناول ''پلیتہ'' کو تاریخ و سوانح سے جوڑنے کی راہ ہموار ہو گئی ہے۔ یہاں مجاور کے کردار اور اس کی باتوں نے گویا اس ناول میں داستانوی رنگ بھی لا دیا ہے اور پھر مختلف علاقوں کی تہذیب کے مناظر بھی کھلتے چلے گئے ہیں۔

یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ یہ ناول عورتوں کے ذکر سے، یا مرد و زن کے فطری جنسیاتی جذبوں کی منظر کشی سے محروم ہے۔ اپنی بیوی کے نام کیپٹن ہائیک کا خط ہو یا گوپی اور رتی کی وہ ملاقات جب رتی کا خوبصورت سینہ، گوپی کے ہاتھ میں آ گیا تھا، یہ بتانے کے لئے

PDF Compressor Free Version

کافی ہے کہ ناول میں گھریلو زندگی بھی ہے، فطری رومان بھی اور جنسی عمل کی عکاسی بھی، البتہ ناول نگار نے ان باتوں کو قدر غالب نہیں بننے دیا ہے اور تلذذ کا رخ فوراً اصل مقصدی بیانات و توقعات کی طرف موڑ دیا ہے۔ خطوط، اخباری تراشوں کی نقل، عدالتی کارروائی اور بہت سارے فکری و فلسفیانہ مقولات اور ادبی و شعری شذرات کے سہارے ناول ''پلیتہ'' کی تاثیر دو آتشہ بنانے میں پیغام آفاقی نے جو کامیابی پائی ہے، اسے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

یہاں موضوعات کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر ہے اور ان کے تعلق سے نہایت عمدہ اسلوب میں نظریات و افکار کے انگنت لعل و گہر بکھرے پڑے ہیں۔ مثال کے لئے آگے بڑھنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ محض دو اقتباسات سپرد قرطاس کردئے جائیں:

''جمہوریت میں کوئی حاکم یا محافظ نہیں ہوتا، یہاں سبھی شکاری یا شکار ہوتے ہیں۔ جو اس بات کو سمجھتا ہے وہ شکاری بن کر رہتا ہے جو نہیں سمجھتا وہ شکار بن کر رہتا ہے اور شکاریوں سے رحم کی امید رکھتا ہے۔ ان سے بے رحمی کے گلے کرتا ہے اور اپنے لئے ایسے شکاری کی تلاش میں رہتا ہے جو اس سے وفا کرے۔ کچھ شکاری ایسے وفادار جانوروں کو پالتو مویشی بنالیتے ہیں اور انہیں بوقت ضرورت ذبح کرتے رہتے یا پھر ان کا دودھ دوہتے رہتے ہیں اور زیادہ دودھ حاصل کرنے کے لئے ان کے بچوں کو مکاری کے ساتھ مار دیتے ہیں۔ بڑی بڑی سیاسی جماعتیں محض گوشت خور پیڑ ہوتی ہیں۔ ان کی مسکراہٹیں، ان کے وعدے، ان کی میٹھی آوازیں، سب ٹھگی کے ہتھیار ہوتے ہیں۔'' (پلیتہ ص ۴۹۲)

''وہ کیا کہہ رہا ہے؟ the mind..... وہ اعضائے تناسل کی بات ہی نہیں کر رہا ہے۔ وہ اس مردانہ قوت کی بات کر رہا ہے جس کے اوپر نسل کو آگے بڑھانے اور اس کی بھرپور ترقی کی وہ ذمہ داری ہے جس سے وہ کسی بھی حال میں بری الذمہ نہیں ہوسکتا اور وہ سمجھ گیا ہے کہ اس طاقت کے کھلے استعمال کا وقت آگیا ہے اور ہماری ساری رسوائیوں کی وجہ اسی طاقت کے دبے ہونے کی وجہ سے ہے کہ ہم نے اپنی سوچ کو اپنی اس طاقت پر اس طرح حاوی کرلیا ہے گویا یہ طاقت compromisable ہے۔ یہ لڑکا اسی بات کو رد کرنے کا تقاضا کر رہا ہے اور چیخ کر اور پوری طاقت کے ساتھ کر رہا ہے۔ وہ اپنے ذہن کے جمود اور اس کی غلامی کی زنجیروں کو اپنی قوت بقا کے ہتھوڑوں سے توڑنے کی جدوجہد کر رہا ہے۔ یاد رکھئے کہ عورت سے مباشرت کے بعد نیا بچہ پیدا ہوتا ہے، لیکن ذہن سے مباشرت کے بعد نئی دنیا پیدا ہوتی ہے۔ یہ بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ انسان کی جنسی قوت اس کے ذہن سے عظیم تر قوت ہے۔ یہ قوت جب ذہن کی طرف عمل پیرا ہوتی ہے تو عظیم قومیں پیدا ہوتی ہیں اور جب یہ اعضائے تناسل کی طرف قید ہوجاتی ہے تو صرف غلاموں کی آبادی پیدا ہوتی ہے۔ یہ جنس ہی تخلیق کی روح ہے اور اس قوت کا باہری قوتوں کے سامنے برسرپیکار رہنا روح کے زندہ ہونے کی دلیل ہے۔''

(پلیتہ ص ۵۸۲)

یہ عین ممکن ہے کہ جمہوریت کا جو تجزیہ کیا گیا ہے وہ محض عصری کرب سے اکتاہٹ کا نتیجہ ہو اور ہمارے لئے بالکل قابل قبول نہ ہو، لیکن اس میں ایک فکری وزن اور مشاہداتی کیف و کم ضرور ہے۔ اسی طرح دوسرے اقتباس میں بھی جو باتیں آئی ہیں ان پر منطقی رخ سے بحث ہوسکتی ہے، مگر اس میں جو تجزیاتی قوت ہے اس سے انکار آسان نہیں۔

پیغام آفاقی کا ناول ''پلیتہ'' بیشک اس بات کا گواہ ہے کہ وہ امید و یقین کے سورج پر نگاہیں مرکوز رکھنے والے سچے ادیب تھے اور جہاں تک اپنی تحریروں سے تاریکی کو روشنی میں بدلنے کی بات ہے وہ اس معاملے میں دانائے ہنر ہی نہ تھے، دانائے راز بھی تھے۔ ان کے ناول ''مکان'' کی ہر گردش اس کے نسوانی کردار نیرا کی مرہون منت ہے اور

(بقیہ ص ۳۶ پر)

PDF Compressor Free Version

عندلیب عمر
ایس۔آر۔ایف، شعبہ اردو، پٹنہ یونیورسٹی

ناول ''مکان'' کے چند اہم پہلو

فکشن کی فکریات پر ماحول اور زمانے کے ہمہ صورت منظر و پس منظر کے اثرات پڑنا فطری بھی ہے اور ضروری بھی۔ ایک زمانہ اور ایک ماحول وہ تھا جب توہمات کا بول بالا تھا اور اس کے زیر اثر داستانوں میں مافوق فطرت عناصر اور جادوئی کرشمے کا فروغ اپنے نت نئے روپ دکھاتا رہا اور اس صنف کا نگار خانہ حیرت زا بنتا چلا گیا، پھر سائنس و ٹکنالوجی کا ''تعارفی دور'' آیا اور اس نے داستانوں کا جہاں ناولوں میں بدل دیا اور اس کے بعد لگ بھگ سو سال میں جو تبدیلیاں آئیں اور جدید سائنس و ٹکنالوجی کی ترقیوں کے اثرات جس طرح عام ہوتے چلے گئے، اس کے نتیجے میں ۱۹۸۰ء کے بعد لکھے جانے والے ناولوں کی دنیا بھی نت نئی تبدیلیوں سے آشنا ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔

آج کا دور صرف اس لئے اہم نہیں ہے کہ جدید ترقیات کی بہت ساری برکتیں زندگی اور معاشرے کے خدوخال بدل رہی ہیں بلکہ یہ عہد اس لئے بھی بڑا ہی قیمتی ہے کہ اس کے فیضان نے فکشن کی دنیا کو نئے انفس و آفاق سے آشنا کر دیا ہے۔ یہ دور اگر قابل لحاظ ہے تو صرف اس اعتبار سے نہیں کہ دنیا صنعتی انقلاب اور سائنس کی آماجگاہ پر کھڑی ہے بلکہ اس لئے بھی کہ شکست و ریخت کے عوامل آئے دن زیادہ سے زیادہ عجیب و غریب ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ نظریاتی وفاداری کی آسمان کو چھوتی ہوئی عمارتیں زمین دوز ہو گئی ہیں۔ مذہبی ریاکاروں کی فوجیں ہر شہر اور گاؤں میں استحصال کا وحشیانہ منظر پیش کر رہی ہیں۔ اعلیٰ قدروں کی پامالی اور بربادی کے اس دور میں جو ناول لکھے گئے ہیں خواہ وہ عبدالصمد کا ''خوابوں کا سویرا'' اور ''دو گز زمین'' ہو یا الیاس احمد گدی کا ''فائر ایریا'' یا غضنفر کا ''پانی'' بہر حال یہ سبھی ناول عصری المیہ سے اپنی دانشورانہ وابستگی رکھتے ہیں۔ اسی سلسلہ کا ایک اہم ترین ناول پیغام آفاقی کا ''مکان'' بھی ہے اور یقیناً موضوع کے اعتبار سے اس ناول میں ایک ندرت ہے جو قاری کو تہہ در تہہ فکریات کی دنیا میں پہونچا دیتی ہے۔

اس ناول کا مرکزی نسوانی کردار نیرا ایک کم عمر لڑکی ہے جو میڈیکل کی تعلیم لے رہی ہے۔ ایک بوڑھی ماں کے علاوہ اس کا اس دنیا میں کوئی نہیں۔ یہ مکان نیرا کا حال بھی ہے مستقبل بھی اور ناول کی ساخت کے لحاظ سے دیکھیں تو ''مکان'' ایک تہہ در تہہ استعارہ بھی ہے۔ کمار بھی ناول کا ایک علامتی کردار ہے جو جاگیرداری عہد کی یاد دلا دیتا ہے، پھر علاقے کا تھانیدار ہے جو استحصال مزاج کی مدد میں کوئی خرابی نہیں سمجھتا۔ اس ناول کا در پردہ پیغام یہ ہے کہ:

> ''استحصال کی نوعیت کو سمجھنے کے لئے ہمیں استحصال کی عالمی نوعیت پر نظر رکھنی ہوگی۔''

اہم یہ نہیں ہے کہ نیرا ہر ظلم برداشت کرتی ہے بلکہ اہم یہ ہے کہ ہر ظلم اس کی آنکھیں کھولتا جاتا ہے۔ لمحاتی کمزوریوں میں جب وہ اداس ہو جاتی ہے تو اس کا سماجی شعور اسے جدوجہد کے لئے قوت دیتا ہے تاکہ وہ مکان کی اصلی نوعیت کو سمجھ سکے۔

نیرا کی لڑائی اسے اس کا احساس دلاتی ہے کہ:

> ''کسی کی اپنی قوت بھی اس کی اپنی نہیں ہوتی۔ وہ بھی آزادانہ اپنے محور پر ناچ جاتی ہے، جھیلو اور مستقبل میں

PDF Compressor Free Version

اپنے جھیلنے کے عمل کو جاری رکھو۔''

اور جب نیرا کو اپنے آپ پر بھروسہ ہوتا ہے تو وہ غنڈوں کو اس بات پر کہ وہ برباد ہو جائے گی برجستہ کہہ دیتی ہے:

''برباد انسان ہوتے ہیں، بھوت پریت نہیں۔''

نیرا اصل میں سماجی نظام سے لڑنے والی تانیثی قوت کا نام ہے۔ ماحول کردار اور اس کی نفسیاتی الجھنوں کے ساتھ ساتھ شعور کی بیداری کے عناصر و اجزا ناول میں اپنا خاص روپ لے کر ابھرتے ہیں۔ مکالمہ آفرینی اور کشمکش کی عام فضا بھی ناول میں موجود ہے۔ ایک آدمی خواب دیکھتا ہے دوسرا اسے توڑنے کا عمل جاری رکھتا ہے۔ شکست و ریخت کا یہ عمل اپنی نوعیت میں انفرادی نہیں ہے بلکہ سماجی ہے اور یہ ناول کی بڑی کامیابی ہے۔ کمار اور آلو گ ایسے کردار ہیں جو آس پاس مکڑی کے جالوں کی طرح پھیلے ہوئے ہیں۔ نیرا ان سبھوں کے شکنجے میں ہے، لیکن اپنی کی چھپی ہوئی طاقت کا ادراک کر لیتی ہے اور وہ مکڑی کے جالوں کو توڑتی ہوئی آزاد ہو جاتی ہے، اس کی آزادی اور کامیابی میں دراصل ایک پیغام ہے جو ہمیں استحصال قوتوں کی ذہنیت اور ان کے طریق کار کو سمجھنے کا موقع دیتا ہے اور ہمیں خصوصیت کے ساتھ ثانیثیت کے حوالے سے یہ بھی بتاتا ہے کہ صارفیت کا عالمی جبر خواہ کتنا ہی ہو اور مرد اساس استحصال سماج خواہ کتنی ہی کوششیں کرے اور سازشیں رچائے، لیکن اس کے لئے آخر کار ناکامی کے سوا کچھ نہیں شرط صرف یہ کہ ہم حالات کو سمجھیں اور تحفظ کی جدوجہد کے لئے اپنا مخلصانہ کردار کبھی کمزور نہ ہونے دیں۔

مجموعی طور پر یہ ناول عورت کے اندر چھپی ہوئی بے پناہ طاقت اور تحمل کا ایک خوبصورت اظہار ہے اور ہمیں اس کا احساس دلاتا ہے کہ عالمی سطح پر عورت کی آزادی کی جو تحریک چل رہی ہے، ناول نگار اس سے پوری طرح واقف ہی نہیں ہے بلکہ اسے دانشورانہ پشت پناہی بھی دینا چاہتا ہے۔ کوثر مظہری نے ناول ''مکان'' کے بارے میں درست لکھا ہے کہ:

''یہ ناول صرف مکان مالک اور کرایہ دار کی کہانی نہیں پیش کرتا ہے بلکہ معاشرے کی مختلف جہتوں کو سامنے لا دیتا ہے۔ اس ناول سے اندازہ ہوتا ہے کہ پولیس برادری اور معاشرے میں برائیوں کو فروغ دینے والوں کے درمیان ایک طرح کی سانٹھ گانٹھ ہوتی ہے۔ پیغام آفاقی کا تعلق چونکہ پولیس محکمہ سے ہے اس لئے وہ اس کی باریکیوں اور نشیب و فراز کو زیادہ بہتر سمجھتے ہیں۔''

اور کہنا چاہیے کہ حسب امید، انہوں نے نہایت بہتر طریقے سے ان باتوں کو اپنے ناول میں جگہ بھی دی ہے۔

نیرا کا کردار بیشک آئیڈیل کردار ہے، لیکن ہم اسے محض مثالی نہیں کہہ سکتے، کیوں کہ اس میں بہر صورت جد و جہد کا مادہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے، پھر یہ کہ ناول نگار نے سیدھے سادے اسلوب سے کام لے کر ناول کی تاثیر دو چند بنا دی ہے اور ہم اسے محض سپاٹ، یا مصنوعی اور ناہموار کہہ کر بھی نظر انداز نہیں کر سکتے کیوں کہ اس میں فنی بصیرت اور شعور کی پختگی نے بہر حال ناول نگار کے اسلوب کو ایک خاص شناخت ضرور دی ہے۔ بقول شہاب ظفر اعظمی بلاشبہ یہ ناول:

''اپنی طوالت اور بوجھل پن کے باوجود زبان و بیان کی ایسی خوبیاں رکھتا ہے جو قاری کو متاثر بھی کرتی ہیں اور زبان و بیان پر مصنف کی قدرت کا اظہار بھی۔ اس میں نثر کے مختلف اسالیب کا سہارا لیا گیا ہے اور روایتی بیانیہ، خود کلامی، شعور کی رو، مابعد طبیعات، اساطیر اور فکر و فلسفہ کی مدد سے ایسا متن تیار کیا گیا ہے جس میں فن کاری ہے، انفرادیت ہے اور انسانی اقدار کی بازیافت کا ایک روشن اور منور راستہ ہے۔''

دیگر باتوں کے ساتھ ساتھ اس ناول کی یہ خوبی بھی نظر انداز نہیں ہو سکتی کہ اسے پیغام آفاقی نے عورتوں کی زندگی کو تانیثی تناظر میں دیکھنے اور پرکھنے کی نہایت کامیاب سعی کی ہے۔ اس طرح یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ یہ ناول تانیثی آگہی کے سبب ایک اہم پڑاؤ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کی ہیروئن نیرا، اپنی حرکت، اپنے عمل اور اپنے جذبات و احساسات کی بنا پر تانیثی فکر و عمل کی مضبوط ترین آواز بن کر ابھری ہے اور اس کی خود کلامی تانیثی بغاوت کا اعلامیہ بن گئی ہے۔ غرض کہ ''مکان'' کا ایک مختصر تجزیہ بھی اس کی گوناگوں اہمیتوں کا احساس دلانے کے لئے کافی ہے۔ ❁❁

PDF Compressor Free Version

حنا پروین
Moh. Mahatwana, Phulwari Sharif, Patna 801505

مکان: ایک جائزہ

انسانی زندگی کی تین بنیادی ضرورتوں میں روٹی اور کپڑے کے ساتھ مکان بھی شامل ہے اور اس تیسری ضرورت کو اگر ایک بالغ نظر فن کار اپنے ناول کا عنوان بنادے تو پھر اس کی فکری اور فنی بصیرتوں کے طفیل کیسا ادبی شاہکار سامنے آتا ہے، اس کی ایک روشن مثال پیغام آفاقی کا وہ پہلا ناول ''مکان'' ہے جو اس وقت میرے مطالعہ کی میز پر ہے۔

پیغام آفاقی کا اصل نام اختر علی فاروقی ہے۔ ان کے والد شیخ عبدالجبار کا وطن موضع چانپ ضلع سیوان (بہار) ہے۔ آفاقی ۱۰، جنوری ۱۹۵۶ء کو یہیں پیدا ہوئے اور ابتدا سے تیسرے درجے تک چانپ میں تعلیم پائی، پھر وہ سیوان آگئے اور ڈی اے وی سکنڈری اسکول میں داخل ہوئے۔ ہائر سکنڈری کا امتحان سیوان ہی سے پاس کیا، پھر علی گڑھ چلے آئے اور مسلم یونیورسیٹی سے بی اے انگریزی آنرس کے ساتھ کیا۔ یہ ۱۹۷۴ء کی بات ہے، پھر ۱۹۷۷ء میں انہوں نے ایم اے کیا۔ پیغام آفاقی کے احوال پر روشنی ڈالتے ہوئے اردو کے معروف نقاد پروفیسر وہاب اشرفی رقمطراز ہیں:

> ''حصول تعلیم کے بعد وہ مرکزی یونین پبلک سروس کمیشن کے امتحان میں شریک ہوئے۔ انہوں نے انڈین پولس سروس کی ملازمت اختیار کی۔ ان کی شادی ۱۹۷۹ء میں کلکتہ کی رضیہ سلطانہ سے ہوئی۔ پیغام آفاقی جب اسکول میں تھے تو نظمیں کہنے لگے۔ یونیورسیٹی کے زمانے میں 'راگنی' نام کا ایک ناولٹ بھی لکھا، لیکن یہ شائع نہیں ہوا۔ موصوف کا بے حد اہم ناول 'مکان' ۱۹۸۹ء میں شائع ہوا۔ اس کی اشاعت کے ساتھ ہی پیغام آفاقی فکشن کے اہم لکھنے والوں میں شمار ہونے لگے اور ان کا نام ممتاز ناول نگاروں کے ساتھ ہونے لگا۔ اس کی وجہ 'مکان' کے وہ کردار ہیں، جو اپنی انفرادیت کی وجہ سے بے حد نمایاں ہیں۔ کرایہ کے مکان کے بارے میں اردو افسانے ملتے ہیں، لیکن یہاں موضوع محض کسی کرایہ دار کا انخلا نہیں ہے، کردار داخلی اور خارجی عوامل کے ساتھ زندہ اور متحرک ہیں، جن کا اپنا اپنا نقطہ نظر ہے۔ نیرا انصاف کے لئے مختلف قسم کے مراحل سے گزرتی ہے اور اس کے مقابل کا کردار کمار استحصال کے لئے۔ آخر میں فتح نیرا کا مقدر بن جاتی ہے اس طرح یہ ناول ناگفتہ بہ حالت اور سنگین ماحول میں جینے کا سبب بن جاتا ہے۔''
>
> (تاریخ ادب اردو، وہاب اشرفی، ج ۳ ص ۱۳۷۱)

موضوع کے اعتبار سے ناول ''مکان'' میں یقینی طور پر ایک ندرت ہے اور کرداروں کی پیش کش کا ایک خاص ہنر کرایہ داروں کا مکان کو ہڑپ لینا تو کوئی نئی بات نہیں، تاریخ بتا رہی ہے کہ سر چھپانے کی ایک چھوٹی سی جگہ شاہ جہاں نے غیر ملکیوں کو دی تھی اور انجام برسوں کی غلامی میں ظاہر ہوا۔ دراصل ندرت اس موضوع کے تناظر میں پوشیدہ ہے۔ یہ مکان صرف نیرا کا نہیں ہے بلکہ یہ وسیع منظر میں تخلیق کیا گیا ہے۔ یہ اس صنعتی تہذیب کی علامت ہے، جہاں انسان کو ایماندار، خوددار اور عزت دار رہنے کے لئے وہ سب کچھ کرنا پڑتا ہے جسے لفظوں میں بتانا کیا، شاید پہلے پہل سوچنا بھی دشوار ہے۔

''مکان'' کے قصہ میں واقعات کی بہتات نظر نہیں آتی، مگر چھوٹے چھوٹے حادثوں اور جملوں میں ایک جہان معنی ضرور پوشیدہ ہے۔

یہ مکان صرف نیرا کے سر پر چھت نہیں ہے یہ اس کی ملکیت ہی نہیں ہے بلکہ اس کے باپ نے زندگی بھر جو محنت کی ہے اس کا یہ صلہ بھی ہے اور اس کا مستقبل بھی۔ اگر یہ مکان نیرا سے چھن جاتا ہے تو

PDF Compressor Free Version

صرف اس کے سر سے چھت ہی نہیں غائب ہوتی، صرف اس کا روشن مستقبل ہی غائب نہیں ہوتا بلکہ وہ قدریں بھی دفن ہو جاتی ہیں جنہیں قائم کرنے کے لئے ہر زمانے میں ہدایت دینے والوں کا سلسلہ جاری رہا۔ یہ سانحہ چھوٹا نہیں ہے اس میں نظم و ضبط اور اس کے لئے تحفظاتی کوششوں کی ہزار سالہ تاریخ پوشیدہ ہے۔ آدمی نے پہاڑوں کی کھوہ سے جنگلوں اور بیابانوں تک لاکھوں برسوں کا سفر طے کرنے کے بعد مکان بنایا، پھر نظام کی ابتری کو روکنے کے لیے قانون بنایا۔ یہ قانون صرف الفاظ کی جادوگری نہیں ہے بلکہ ان میں کمزور انسانوں کی دھڑکنیں چھپی ہیں، ان کا اعتبار پوشیدہ ہے اور سکون و تحفظ کا احساس جمع ہے۔ اس سکون کو صرف کمار ہی نہیں چھیننا چاہتا ہے بلکہ اسے ایک مضبوط منظم طبقہ ہتھیانا چاہتا ہے اور وہی کرنا چاہتا ہے، جو جاگیرداری عہد میں ہوتا رہا تھا۔ یہ فلسفیانہ نکات ناول کی ابتدا میں خصوصیت کے ساتھ پیش کیے گئے ہیں جو ناول کی فکری اہمیت کا احساس دلاتے ہیں۔

''مکان'' میں نہ قصے کی اہمیت ہے نہ پلاٹ کی تنظیم کی۔ ناول نگار نے ان دونوں کا کوئی خاص اہتمام نہیں کیا ہے۔ یہ ناول نیرا کے کردار کے گرد گھومتا ہے۔ نیرا ایک معصوم لڑکی ہے وہ زندگی کے جن تجربات سے گزر رہی ہے ان تجربات کا مطالعہ کرنے سے ملک کی گھناؤنی تصویریں بڑی بڑی شکلوں میں نظر آتی ہیں۔ نیرا کے پڑوسی ہمیں انقلاب روس سے پہلے کے دستاوسکی کے کرداروں کی طرح نظر آتے ہیں۔ یہ سارے کردار آج کے روبوٹ ہیں، جنہیں کمار اور حکومت کے کارندے اپنے اشاروں پر چلاتے ہیں۔ علاقے کا تھانیدار اپنا فرض بھول کر صرف یہ چاہتا ہے کہ نیرا جیسی آزادی کی فضا میں پرواز کرتی ہوئی فاختہ اس قدر سہم کر رہے کہ نیلے آکاش کا تصور اس کی آنکھوں سے روپوش ہو جائے۔

نیرا ایک سیدھی اور معصوم لڑکی ہے۔ وہ کالج کی طالبہ ہے۔ اس کے سر پر باپ کا سایہ نہیں ہے۔ صرف ایک ماں ہے۔ اس کے باپ نے اس کے لئے اور اس کی ماں کے لئے صرف ایک مکان چھوڑا ہے یہی مکان اس کا واحد سہارا ہے۔ اس مکان میں کمار نام کا ایک کرایہ دار رہتا ہے، جو اس مکان کو ہتھیانا چاہتا ہے۔ بقول ناول نگار:

''نیرا کا مکان بیچ شہر میں تھا اور اس شہر کے پھیلاؤ اور ترقی کے ساتھ ساتھ اس کے مکان کی قیمت دن دونی رات چوگنی بڑھتی جا رہی تھی۔ نیرا اکثر اپنے مکان کی اس بڑھتی ہوئی قیمت کے بارے میں سوچ سوچ کر مستقبل کے تانے بانے بنا کرتی تھی، لیکن ایک دن اسے محسوس ہوا کہ کرایہ دار کی نیت بدل رہی ہے اور کمار بھی دوسرے کرایہ داروں کے مانند بغیر بھاری رقم وصول کیے ہوئے مکان خالی کرنا نہیں چاہتا تو اس کے دل میں ایک گہری چوٹ لگی اور جب کچھ دنوں بعد اسے یہ محسوس ہوا کہ کمار اپنی دولت کی ان دیکھی قوتوں کا سہارا لے کر اس پورے مکان کو ہڑپ لینا چاہتا ہے تو وہ گھبرا گئی۔ پھر جب اس نے کمار کے قدموں کو روکنے کی کوشش کی اور لوگوں کے پاس مدد کے لئے گئی تو دیکھا کہ تمام لوگوں کے چہرے اور تمام چیزوں کے رنگ بدلنے لگے تھے۔ اسے اپنے سامنے کی حقیقت پر خواب کا گمان ہوا اور اسے لگا کہ اس کے مکان کی چھت اب آسمان تک اٹھ گئی تھی اور اس کی دیواریں افق تک بھاگ گئی تھیں۔ یہی نہیں اسے تو اب ان تمام چیزوں میں جو اب تک چھوٹی چھوٹی اور اکہری دکھائی دے رہی تھی متعدد شکلیں دکھائی دینے لگی تھیں۔'' (مکان، ص ۷، ص ۸)

آخر کار نیرا کمار سے لڑنے کو کمر بستہ ہوتی ہے۔ اس لڑائی میں وہ ہر ظلم کو برداشت کرتی ہے اور ہر ظلم اس کی آنکھیں کھولتا چلا جاتا ہے۔ لمحاتی کمزوریوں میں جب وہ اداس اور ملول رہتی ہے تو اس کا سماجی شعور اسے جدوجہد کے لئے ٹہوکے دیتا ہے تاکہ وہ مکان کی اصل نوعیت کو سمجھ سکے اور تب اسے اس کا یقین ہوتا ہے کہ اسے وشائیں تلاشنے اور متعین کرنے کی ضرورت ہے۔ اس الجھی ہوئی زندگی میں اگر اسے سنبھلنا ہے تو اس کے لئے صحیح سمتوں کی تلاش لازم ہے کیونکہ وہی اسے بچا سکتی ہے۔ اسے اپنی جگہ مضبوط رہنا ہوگا اور آنکھیں کھلی رکھنی ہوں گی، لہٰذا وہ وشاؤں کی تلاش کے بارے میں سوچنے لگی تو اچانک اسے یہ شعور ملا کہ:

PDF Compressor Free Version

''تم سمجھتے ہو کہ میں ایک کمزور لڑکی ہوں۔ میں عورت ہوں میں ایک سمندر ہوں کہ جس میں پورا پورا پہاڑ غرقاب ہوسکتا ہے۔ میں کوکھ ہوں میرے اندر جو عکس پیدا ہوتا ہے وہ محض خیالی نہیں ہوتا۔'' (مکان، ص ۱۳۹)

نیرا کو اس لڑائی میں یہ احساس ہوتا ہے کہ:

''کسی کی اپنی قوت بھی اس کی اپنی نہیں ہوتی۔ وہ بھی آزادانہ اپنے محور پر ناچتی ہے۔ جھیلو اور مستقبل میں اپنے جھیلنے کے عمل کو جاری رکھو۔'' (مکان، ص ۱۶)

اور جب نیرا کو اپنے آپ پر بھروسہ ہوتا ہے تو وہ غنڈہ کی اس بات پر کہ وہ برباد ہو جائے گی برجستہ جواب دیتی ہے کہ:

''برباد انسان ہوتے ہیں۔ بھوت پریت برباد نہیں ہوتے۔'' (مکان، ص ۱۵۲)

شروع سے آخر تک نیرا سماجی نظام سے لڑتی ہے۔ جوں جوں اسے اپنے آپ پر یقین ہوتا جاتا ہے، کمار کی شکست سامنے دکھائی دیتی ہے اور پھر وہ لمحہ بھی آتا ہے جب وہ اس شکست کو تسلیم کر لیتا ہے اور نیرا اس جدوجہد میں اپنے ایقان، صداقت، موت سے بے خوفی اور استقامت کے ذریعہ کامیاب ہو جاتی ہے۔ بقول شہاب ظفر اعظمی:

''غالباً پہلی بار کسی ناول نگار نے ایک ایسا کردار دیا ہے جو ہر قوت کے مقابلے میں زیادہ قوت والا نکلا۔ بالخصوص نسوانی کردار کو اتنی مضبوطی اور استقلال کے رنگ میں رنگ کر شاید پہلی بار پیش کیا گیا ہے۔''

اس طرح کہہ سکتے ہیں کہ نیرا کی شکل میں پیغام آفاقی نے اردو ناول کو ایک انمول اور انمٹ کردار دیا ہے۔ ❁❁

ٹوٹنے کے بعد کی کہانی (ص ۹ سے آگے)

مجاہد زندگی کے معنی حاصل کرتے ہیں۔ نیرا وہ طاقت ہر انسان کے اندر ہے۔ یہ جڑ ہے جس سے انسان اپنی زندگی کی اصل خوراک حاصل کرتا ہے۔''

نیرا کی تخلیقیت کی اس کہانی کو پڑھتے وقت قاری اپنے اندرون میں ایک اُبھرتی ہوئی قوت کی گونج سنتا ہے اور بعض بعض موڑ پر خود کو بدلتا ہوا محسوس کرتا ہے اور جب نیرا کے ساتھ شملے کی پہاڑیوں پر چڑھتا ہے تو نیرا کی طرح وہ بھی پہاڑی راستوں، اندھے موڑوں، خوفناک گھاٹیوں اور خطرناک اونچائیوں کو بے پروائی سے روندتا ہوا گزرتا چلا جاتا ہے اور ایک سرور کی سی کیفیت بھی محسوس کرتا ہے۔ اس طرح پیغام آفاقی کا یہ ''مکان'' اپنے قاری کو بھی ایک ایسی بلندی پر پہنچا دیتا ہے جہاں زندگی نغمہ بن جاتی ہے اور روح لذتوں سے بھر جاتی ہے۔

ممکن ہے اگلی بار پڑھنے پر مکان کسی اور ہی صورت میں نظر آئے اور اس کے در و دیوار سے معنی کا کوئی اور ہی چہرہ نکل آئے۔ قاری کی نگاہ میں ''مکان'' کی بار بار بدلتی ہوئی شکل اسے ایک ایسی بلندی عطا کرتی ہے جو اسے فن کی عظمتوں کی طرف لے جاتی ہے۔ ❁❁

ناول پلیتہ: ایک مطالعہ (ص ۱۳ سے آگے)

ناول ''پلیتہ'' کی ہر فکری جہت خالد سہیل کے ذہن و دماغ اور اس کی منطقیت کے اردگرد گھوم رہی ہے۔ پیغام آفاقی کا یہ ناول یقیناً ''مکان'' سے زیادہ موضوعی وسعت رکھتا ہے، البتہ یہ ضرور ہے کہ بہت سے موضوعات جو وہاں نمایاں تھے، یہاں بھی نمایاں ہیں اور اس کی وجہ یہی ہے کہ ان دونوں ناولوں کی اشاعت میں اتنے برسوں کا فاصلہ تو ضرور آ گیا ہے، جتنے برسوں میں ایک نئی نسل کھڑی ہو جاتی ہے، لیکن بنیادی اور حساس عصری مسائل وہی ہیں جو ''مکان'' کی تخلیق کے شب و روز میں تھے۔

پیغام آفاقی کا پہلا ناول بیسویں صدی کے اواخر کی اور دوسرا ناول اکیسویں صدی کے اوائل کی سوغات ہے اور کہنا چاہئے کہ تاریخی تناظر اور انسانی نفسیات کی تجزیہ کاری کے ساتھ ناول نگار نے اسے ایک یادگار بنا دیا ہے اور بڑی خوبصورتی سے یہ دکھایا ہے کہ افکار و جذبات کا تنزل کس طرح تاریخ کے مختلف ادوار میں ترفع سمجھا جاتا رہا اور اس نے کس طرح نہ صرف یہ کہ بربریت و بہیمیت کے راستے کھول دیے بلکہ اسے مزید کشادگی دینے کے لئے ذہن و فکر کی نئی ساخت بھی بنا دی، ایسی ساخت جس کی اصل شناخت میں ہی نجات ہے۔ ❁❁

PDF Compressor Free Version

محمد فہام الدین

M.A. Urdu Final Year, Deptt. of Urdu, Delhi University, Delhi 110025 (Mob. 9069422726)

پیغام آفاقی بحیثیت افسانہ نگار

اردو افسانے کا باضابطہ آغاز پریم چند کے ہاتھوں بیسویں صدی کی ابتدا میں ہوا اور بہت جلد اس صنف نے توقع سے کہیں زیادہ ترقی کر لی۔ ابتدا ہی سے اردو افسانے میں نئے نئے تجربات کیے جاتے رہے، پھر ایک وقت ایسا آیا جب افسانہ قاری سے دور ہوتا چلا گیا اور افسانے کی کڑیاں بکھرتی چلی گئیں، لیکن جلد ہی صورتحال بدلی اور افسانے کی رسائی عام قاری تک ہوئی۔ افسانے کی گم ہوتی ہوئی کڑیوں کو جوڑنے اور اسے پھر سے ادب کی ایک دلکش صنف بنانے میں دوسرے کئی لوگوں کے ساتھ ساتھ ایک نام پیغام آفاقی کا بھی ہے۔ یوں تو پیغام آفاقی کی زیادہ شہرت ان کے ناول ''مکان'' کی وجہ سے ہوئی، لیکن ادب کی ایک روایت یہ بھی رہی ہے کہ اگر تخلیق کار کی کوئی ایک کتاب مشہور و مقبول ہو جائے تو بیشتر ناقد اسی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں اور مصنف کی دوسری کتابوں کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ یہی بات پیغام آفاقی کے ساتھ بھی پیش آئی۔ ''مکان'' کی شہرت کے آگے ان کے افسانے کی طرف خاطر خواہ توجہ نہیں دی گئی، بقول احمد کفیل:

> ''پیغام آفاقی کو ناقدین یا تو ناول نگار کی حیثیت سے یا پھر شاعر کی حیثیت سے جانتے ہیں۔ ناول میں 'مکان' بقول پروفیسر وہاب اشرفی ان کے نام سے زیادہ معروف ہو چکا ہے اور ان کی شہرت کا دوسرا کارنامہ شعری مجموعہ 'درندہ' ہے اور ڈاکٹر ارتضیٰ کریم نے بھی بحیثیت ناول نگار انہیں ایک اچھا فن کار تسلیم کیا اور افسانے سے متعلق صرف اتنا لکھا ہے کہ پیغام آفاقی نے افسانے تو لکھے ہیں مگر بہت کم۔'' (بہار کے چند نامور افسانہ نگار، مشمولہ جہان اردو، رابعہ مشتاق، ص ۲۵۹)

اس اقتباس سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ ادب کے ناقدین نے پیغام آفاقی کو بطور ناول نگار ہی پیش کیا ہے یا زیادہ سے زیادہ شاعر، لیکن پیغام آفاقی کے افسانے کی پہلی قرأت ہمیں چونکاتی ہے کہ پیغام آفاقی بطور افسانہ نگار بھی بے حد اہم ہیں اور افسانہ نگاروں کی صف میں ایک بلند و بالا مقام رکھتے ہیں۔

پیغام آفاقی کے افسانے ہمیں عہد حاضر کے مسائل سے آگاہ کرتے ہیں۔ مثلاً تقسیم ہند کے بعد فرقہ وارانہ فسادات سے پیدا ہونے والے خوف و ہراس کو پیغام آفاقی نے اپنے کئی افسانوں میں موضوع بنایا ہے۔ اس موضوع پر لکھے گئے افسانوں میں ان کا افسانہ ''مسافر'' ایک شاہکار کا درجہ رکھتا ہے، حالانکہ لوگوں نے زیادہ توجہ اس طرف نہیں دی۔ افسانہ ''مسافر'' کا کردار اسلم ایک ایسا کردار ہے جسے پیغام آفاقی نے حیات جاوداں عطا کر دی ہے۔ انسانیت کا رول ماڈل اسلم کے کردار کو دیکھنے کے بعد سعادت حسن منٹو کے اس موضوع پر لکھے گئے افسانوں کے کردار ذہن میں گردش کرنے لگتے ہیں۔ ''مسافر'' فرقہ وارانہ فسادات پر مبنی ایک بہت ہی اچھا اور پیغام آفاقی کا سب سے اہم افسانہ ہے۔

اس افسانے میں پیغام آفاقی نے انسانی رشتوں میں گراوٹ اور آپسی انتشار کو بہت ہی سلیقے سے ایک پرکشش انداز میں پیش کیا ہے۔ نہ صرف تقسیم ملک کے مسائل کو انہوں نے اپنے اس افسانے کے توسط سے سامنے لایا ہے بلکہ ساتھ ہی ساتھ معاشرے کی اصلاح کرنے کی کوشش بھی کی ہے۔ ''کوآپریٹیو سوسائٹی'' پیغام آفاقی کا جدید معاشرہ کے لوگوں کی چاپلوسی، جعل سازی اور مفاد پرستی پر مبنی افسانہ ہے۔ جدید سوسائٹی میں لوگ کس طرح سے دوسرے لوگوں پر

PDF Compressor Free Version

انگلی اٹھاتے ہیں اور دوسرے شخص کو تنقید کا نشانہ بناتے ہیں، جب کہ خود ان کے اندر نہ جانے کتنی کمزوریاں ہوتی ہیں، اس کا پورا نقشہ اس کہانی میں آ گیا ہے۔ ایک طرح یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ جدید سوسائٹی کی نام نہاد ترقی اور کھوکھلے پن کو "کوآپریٹیو سوسائٹی" میں ہر پہلو سے پیش کر دیا گیا ہے۔

جب انسان دیہی زندگی سے نکل کر اپنی ترقی کے لیے شہر کی طرف رخ کرتا ہے تو اسے کتنے مسائل سے دوچار ہونا پڑتا ہے اور اس کے لئے کس طرح سے پریشانیوں کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو جاتا ہے، اس بات کو بھی پیغام آفاقی نے بہت اچھے انداز سے پیش کیا ہے۔ "پیتل کی بالٹی" اس موضوع پر مبنی ایک بے حد اہم افسانہ ہے اور بیشتر ناقدین ادب نے اس کی اہمیت تسلیم کی ہے۔

پیغام آفاقی کے بہت سے افسانے شائع ہو چکے ہیں۔ ایک افسانوی مجموعہ بھی منظر عام پر آ چکا ہے۔ انہوں نے اپنے افسانے میں علامت کا بھرپور استعمال کیا ہے، لیکن کہیں بھی کوئی پہلو تاریک یا مبہم نظر نہیں آتا۔ ہر قاری اپنی پہنچ کے مطابق نتیجہ اخذ کرتا ہے۔

بابری مسجد کا سانحہ پیش آیا تو بہت سے افسانہ نگاروں نے ایک سے بڑھ کر ایک افسانے لکھے۔ اس وقت بھی پیغام آفاقی پیچھے نہیں رہے۔ "کیا کر رہے تھے" کے عنوان سے انہوں نے ایک افسانہ لکھا۔ انداز الگ تھا، لیکن جذباتی کیفیت نہیں تھی۔ بنگلہ دیشی گھس پیٹھیوں پر "دستخط" کا یہ اقتباس دیکھئے:

> "ان جھگیوں میں کام کرنے والے طرح طرح کے پیشے میں تھے، لیکن عورتیں عموماً گھروں میں کام کرتی تھیں۔ بنگالی حسن کی اپنی ایک خاص جاذبیت ہوتی ہے اور یہ جوان عورتیں اور لڑکیاں جادوگرنیوں کی طرح آس پاس کی کولونیوں میں پھیلی ہوئی تھیں۔ اس پورے علاقے میں ان کی کہانیاں گشت کرتی رہتی تھیں، لیکن ان کہانیوں سے بھی زیادہ پراسرار کہانیاں ان کے شہر کی کئی بڑی جگہوں پر سیاستدانوں، تاجروں اور ہوٹلوں میں جانے سے متعلق تھیں اور یہ بھی ان کی آمدنی کا ذریعہ اور اس دلال کے ہفتے اور اس کے ذریعے پولس والوں کی مستقل کمائی کا ذریعہ بن چکا تھا۔ یہاں کوئی نہیں چاہتا تھا کہ یہ واپس جائیں اور اس طرح وہ یہاں کی زندگی میں رچ بس گئے تھے۔"

پیغام آفاقی کے افسانے یقیناً اہم موضوعات کو چھوتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ انہوں نے جنسی موضوعات پر کھل کر کئی افسانے لکھے ہیں، لیکن افسانہ کہیں بھی اخلاقی سطح سے نیچے نہیں ہے۔ انہوں نے بیانیہ انداز میں بھی افسانے لکھے ہیں اور علامتی انداز میں بھی۔ ان کے زیادہ تر افسانے واحد متکلم میں ہیں۔

پیغام آفاقی کے افسانوں کی زبان اپنے اندر جاذبیت رکھتی ہے۔ موضوع فساد کا ہو یا جنسی، عہد حاضر کے مسائل ہوں یا دیہی اور شہری زندگی کے مسائل، ہر موضوع پر لکھے گئے افسانوں کی زبان صاف ستھری اور عام فہم ہے اور اس وصف نے بلاشبہ ان کے افسانوں کو انفرادیت بھی عطا کر دی ہے اور خاص حسن بھی بخش دیا ہے۔

مختصر یہ کہ پیغام آفاقی ناول نگار اور شاعر ہی نہیں تھے بلکہ افسانہ نگار بھی تھے۔ انہوں نے ہر موضوع پر بڑی بے باکی سے لکھا ہے اور خوب لکھا ہے اور یہ ثابت کر دیا ہے کہ ان کی حیثیت ایک منفرد افسانہ نگار کی بھی ہے۔ افسانہ "مافیا"، "نیا سفر"، "پیتل کی بالٹی"، "قطب مینار"، "مسافر"، "بوڑھا ملازم"، "کوآپریٹیو سوسائٹی" اور "دستخط" وغیرہ افسانے کی دنیا میں پیغام آفاقی کی انفرادی شناخت کے لئے کافی ہیں۔

ادب کا فریضہ

ادب کا یہ فریضہ ہے کہ وہ ہدایت نہیں بلکہ بصیرت کے ذریعہ تمام کرداروں کے ذہن کو روشن کر دے اور تمام کرداروں کو اپنے اندر دور اندیشی کی صفات پیدا کرنے کا سامان مہیا کرے۔ زمانہ قدیم سے ہی اہل بصیرت اپنے زمانے کے حکمرانوں کی تربیت کرتے رہے ہیں۔ دنیا کا ادب ایسی کہانیوں سے بھرا پڑا ہے جن کا نشانہ ارباب حل وعقد کے ذہنوں کو انسانی قدروں سے معمور کرنا ہے۔ (ناول "پلیتہ" ص ۴۸۵)

PDF Compressor Free Version

مہاشویتا دیوی: یادیں اور باتیں

ڈاکٹر مشتاق احمد

Principal Marwari College, Darbhanga (Mob. 9431414586)

مہاشویتا دیوی: حاشیے پر کھڑی زندگی کی ترجمان

مشرقی ادبیات کی جن چند شخصیات کو عالمی شہرت حاصل ہے ان میں بنگلہ زبان کی مصنفہ مہاشویتا دیوی امتیازی حیثیت کی حامل ہیں۔ اگرچہ ان کا وسیلہ اظہار ہمیشہ بنگلہ زبان رہا ہے، لیکن ان کی تخلیقی زندگی کے دور آغاز سے ہی ان کی تخلیقات کا ترجمہ ہندوستان کی مختلف زبانوں میں ہوتا رہا، جس کی وجہ سے وہ کبھی کسی خاص زبان یا خطے تک محدود نہیں رہیں۔ وہ ہمہ جہت شخصیت کی ملکہ تھیں، بیک وقت سماجی کارکن، صحافی، ناول نگار، افسانہ نگار اور ساتھ ہی ساتھ وہ ایک سرگرم سیاسی کارکن بھی تھیں۔

ان کے حیات وماحول کا سرسری جائزہ لینے سے یہ حقیقت واضح ہوجاتی ہے کہ ان کی پرورش ایک ادبی گھرانے میں ہوئی تھی۔ وہ غیر منقسم ہندوستان کے ڈھاکہ میں ۱۴ جنوری ۱۹۲۶ء کو پیدا ہوئیں، ان کے والد منیش گھٹک بنگلہ زبان کے معروف شاعر تھے جبکہ ان کی والدہ دھارتری دیوی بنگلہ زبان کی ایک مشہور ادیبہ اور سماجی رضا کارہ تھیں اور ان کے چچا رتک گھٹک اپنے وقت کے ایک معروف فلم ساز تھے۔ تقسیم وطن کے بعد ان کا خاندان کلکتہ منتقل ہوگیا اور یہیں شانتی نکیتن یعنی وشو بھارتی یونیورسٹی میں انہوں نے اپنی تعلیم مکمل کی۔ بعد میں کلکتہ یونیورسٹی سے انگریزی ادب میں ماسٹر ڈگری حاصل کی۔ انہوں نے اپنی عملی زندگی کا آغاز بحیثیت انگریزی لکچرر وجے گڑھ کالج میں ۱۹۶۴ء سے کیا اور ۱۹۸۴ء تک وہ پیشہ درس وتدریس سے وابستہ رہیں۔

ان کی ازدواجی زندگی اگرچہ خوش گوار نہیں رہی کہ ان کی پہلی شادی وجن بھٹا چاریہ جیسے ادیب سے ہوئی، جبکہ دوسری شادی انہوں نے اسین گپتا سے کیا۔ اس دوہری زندگی سے وہ کافی حد تک پریشان رہیں جس کی وجہ سے انہیں ہمیشہ نشیب وفراز کا سامنا رہا، تاہم ان کا تخلیقی سفر رواں دواں رہا۔ ظاہر ہے جن مشکلات اور حوادث سے انہوں نے سمجھوتہ کیا تھا اس سے وہ ہرگز برگشتہ نہ تھیں، مگر اس وجہ سے زندگی کے آخری ایام تک ان کے تجربوں اور مشاہدوں نے انہیں گردشوں کا خوگر اور ایک زمانہ شناس ادیب وفنکار ضرور بنادیا تھا۔

مہاشویتا دیوی کا تاریخی شعور بہت ہی پختہ تھا اور سماجی و سیاسی بصیرت وبصارت کے معاملے میں بھی وہ یکتائے روزگار تھیں۔ ان کی تخلیقات اس بات کی غماز ہیں کہ انہوں نے جو کچھ لکھا ہے، وہ محض تخیل کی دنیا نہیں ہے بلکہ اس کا رشتہ حقیقی زندگی سے ہے۔

مہاشویتا دیوی ہندوستانی ادب کی اولین خاتون ہیں جنہوں نے قبائلی زندگی کو اپنی تخلیقات کا موضوع بنایا۔ انہوں نے قبائلی زندگی کا بہت قریب سے مطالعہ کیا کہ وہ برسوں ان کے درمیان رہیں۔ واضح ہو کہ مہاشویتا دیوی نے جھارکھنڈ، مغربی بنگال اور مدھیہ پردیش کے جنگلی علاقوں میں رہ کر وہاں کے پہاڑی، منڈا، سنتھال اور دیگر قبائلی طبقے کی زندگیوں کے مسائل کا مشاہدہ کیا اور اپنے مستحکم تخلیقی وژن کی بدولت آدیباسیوں کو اپنے فکر وفن کا محور ومرکز بنایا۔ انہوں نے اپنے ایک انٹرویو میں یہ اعتراف کیا ہے کہ:

> ''میں ان کے بارے میں لکھتی ہوں جو سماج میں حاشیے پر ڈھکیل دیے گئے ہیں، اگر آپ غریب ہیں، کمزور ہیں تو چاہے عورت ہوں یا مرد، بچہ ہوں یا ضعیف آپ کا استحصال ہوگا۔ میری کہانی صرف عورتوں کے بارے میں نہیں ہے، یہ پورے سماج کی آئینہ دار ہے۔''

بلاشبہ ان کے درجنوں ناول اور بے شمار کہانیاں قبائلی زندگی کی عکاس ہیں۔ انہوں نے قبائلی عورتوں کے جنسی استحصال، طبقاتی کشمکش اور ان

PDF Compressor Free Version

علاقوں کی شطرنجی سیاست کو موضوع بنایا اور چونکہ ہندوستانی ادب میں پہلی بار قبائلی زندگی کو تخلیقی صورت میں پیش کیا گیا تھا، اس لئے مہاشویتا دیوی کی تخلیقات کو نہ صرف ادب کے سنجیدہ حلقے میں مقبولیت حاصل ہوئی، بلکہ ان کی تخلیقات شعبہ سماجیات اور تاریخ کے دلدادوں کے لئے بھی سامان آگہی ثابت ہوئیں۔

ان کا پہلا ناول ''جھانسی کی رانی'' ۱۹۵۶ء میں جب شائع ہوا تو اس نے نہ صرف بنگلہ ادیبوں کو متوجہ کیا بلکہ ماہرین سماجیات و سیاسیات کے درمیان بھی مہاشویتا دیوی کی شناخت مستحکم ہوئی۔ واضح ہو کہ جھانسی کی رانی تاریخ ہند میں ۱۸۵۷ء کی پہلی جنگ آزادی کی خاتون آہن تھیں اور اب تک انہیں تاریخ کی کتابوں میں امتیازی مقام حاصل تھا، لیکن مہاشویتا دیوی نے دنیائے ادب میں جھانسی کی رانی کو ابدی کردار کا مقام عطا کیا۔ انہوں نے اس ناول میں مدھیہ پردیش کے قبائلی علاقے کے لوک گیت اور سینہ بہ سینہ چلی آرہی روایتوں کو تخلیقی پیرائے میں پیش کیا اور اس طرح ماہرین سماجیات کے لئے تحقیق کا ایک نیا در کھول دیا۔ انہوں نے اس ناول کو لکھنے سے پہلے گوالیار اور جھانسی کے دشوار گزار علاقے میں گھوم گھوم کر مواد جمع کیے اور پھر اسے تخلیقی زبان کی صورت میں پیش کیا۔

اسی طرح ان کا ناول ''نٹی'' ۱۹۵۷ء میں منظر عام پر آیا تو بنگلہ ادب میں ایک ہلچل سی مچ گئی۔ جیسا کہ یہ بات عام ہے کہ مہاشویتا دیوی ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر لکھنے والی ادیبہ نہیں تھیں بلکہ انہوں نے جو کچھ بھی لکھا اس کے لئے برسوں تگ و دو کی، اس کے ساتھ ہی جس موضوع پر لکھنا چاہا اس کی تہوں تک پہنچنے کی کوشش کی۔ ان کا ناول ''اگنی گربھ''، ''ہزار چوراسی کی ماں''، ''جنگل کے دعویدار''، ''اینٹ کے اوپر اینٹ''، ''عمر قید''، ''جگڑن''، ''گہراتی گھٹائیں''، ''ماسٹر صاحب''، ''مرڈرر کی ماں''، ''بنیا بہو اور گرام بنگلہ'' کے مطالعے سے یہ عقدہ اجاگر ہوتا ہے کہ مہاشویتا دیوی حاشیے پر کھڑی زندگی کی ترجمان تھیں۔ اس معنی میں وہ ایک مقصدی ادیبہ تھیں کہ ان کے لکھنے کا ایک واضح مقصد تھا، وہ اپنی تخلیقات کے ذریعہ پسماندہ، دلت اور محروم طبقے بالخصوص قبائلیوں کی زندگی کے حقائق کو پیش کرنا چاہتی تھیں۔

ان کے ناولوں کے کردار ہوں یا ان کی کہانیوں کے کردار سب کے سب حقیقی زندگی جینے والے کردار ہیں جن سے ہم اور آپ اپنے گردونواح میں روز روبرو ہوتے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ہم عام لوگ بس یونہی دیکھ کر گزر جاتے ہیں جبکہ مہاشویتا دیوی کے اندر کا فنکار اس بے بس زندگی کی آئینہ داری کر کے ہمیں سوچنے پر مجبور کر دیتا ہے۔

ان کا ناول ''رودالی'' اور ''سدھو کانہور ڈاکے'' دلت و قبائلی طبقے کی اذیت ناک زندگی کی سچائیوں سے روشناس کراتا ہے اور عہد فرنگی میں قبائلیوں کے ساتھ جس طرح کا وحشیانہ سلوک کیا جاتا تھا اس کی تاریخ رقم کرتا ہے۔ اسی طرح ''ارنیر ادھیکار'' میں قبائلیوں کے مسیحا برسا منڈا کی خدمات کو اجاگر کیا گیا ہے کہ برسا کو آخر قبائلی، بھگوان کا روپ کیوں کر مانتے ہیں۔

انہوں نے آدیباسی عورتوں کی خرید و فروخت اور ان کے جنسی استحصال کی خلاف نہ صرف آواز بلند کی بلکہ اسے ایک تحریک کی صورت بھی دی۔ انہوں نے اپنی درجنوں کہانیوں میں قبائلی عورتوں کی حقیقی زندگی کو پیش کر کے ہمارے مہذب سماج کو آئینہ دکھانے کا کام کیا۔ انہوں نے طوائف کی زندگی کو بھی اپنی تخلیقات کا موضوع بنایا اور انہیں سماج کے مین اسٹریم سے جوڑنے کی وکالت کی اور جب کبھی موقع ملا تو سیاسی گلیاروں کی گندگی کے خلاف بھی آواز بلند کی۔

وہ مارکسزم سے متاثر تھیں، لیکن جب انہیں یہ احساس ہوا کہ مارکسی نظریہ کمزور ہوتا جا رہا ہے اور ہمارے مارکسسٹ لیڈران کا نصب العین بھی بدل رہا ہے تو انہوں نے مارکسزم کے خلاف نہ صرف لکھا بلکہ عملی طور پر بھی اس تحریک میں شامل ہوئیں جو تحریک بنگال میں مارکسسٹوں کے خلاف شروع ہوئی تھی، مثلاً سنگور اور نندی گرام میں وہ ممتا بنرجی کی حمایت میں کھڑی ہوئیں اور دیگر بنگلہ ادیبوں کو بھی ممتا بنرجی کی حمایت کرنے کی جانب متوجہ کیا، نتیجتاً دیکھتے ہی دیکھتے بنگلہ ادیبوں کی ایک بڑی جماعت ممتا بنرجی کی حمایت میں صف بند ہو گئی۔

ہم اردو والوں کی بدنصیبی ہے کہ مہاشویتا دیوی کی تخلیقات کا ترجمہ اردو میں بہت کم ہو سکا ہے، البتہ ان کے بیشتر ناولوں اور کہانیوں کا ترجمہ ہندی میں موجود ہے۔ بالخصوص ''وانی پرکاشن'' نے ان کی تخلیقات کو

PDF Compressor Free Version

ہندی میں منتقل کرنے کا بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اردو میں بھی ان کی تخلیقات کے تراجم ہوں تا کہ اردو کا عام قاری بیسویں صدی کی ایک نابغہ روزگار شخصیت کے افکار و نظریات سے استفادہ کر سکے، کیوں کہ آزادی کے بعد بین علومی مطالعے کی روایت کم ہوتی جا رہی ہے، اس کی وجہ سے ہم اردو والے مشرقی ادب کے دیگر تخلیق کاروں کے شہ پاروں سے محروم ہوتے جا رہے ہیں۔

مہاشویتا دیوی کا ایک مشہور ناول ''استری پرو'' اور ''دولتی'' ہے، اسی طرح ''چوٹی منڈا اور اس کا تیر'' ایک سوانحی ناول ہوتے ہوئے بھی ایک تخلیقی شہ پارہ ہے۔ ان کے ناول ''ہزار چوراسی کی ماں'' پر فلم کار گووند نہلانی نے ۱۹۹۸ء میں اسی نام سے ایک فلم بنائی تھی۔ یہ ناول نکسل تحریک سے وابستہ سرگرمیوں کی ایک تخلیقی دستاویز ہے۔ اسی طرح ان کے ناول ''رودالی'' پر بھی کلپنا لازمی نے ۱۹۹۳ء میں ایک فلم بنائی تھی، ان کی ایک مختصر کہانی ''چولی کے پیچھے'' پر بھی کئی زبانوں میں فلمیں بنائی گئی ہیں۔ بالخصوص اطالوی زبان میں ایتالو اسپینلی نے مہاشویتا دیوی کی تخلیقات کو نہ صرف منتقل کرنے کا کارنامہ انجام دیا ہے بلکہ ان کی کہانیوں پر فلمیں بھی بنائی ہیں۔

مہاشویتا دیوی کی ہمہ جہت شخصیت کسی انعام و اکرام کی محتاج نہیں تھی کہ انہوں نے اپنے مصلح افکار و نظریات اور سماجی سروکار کی بدولت پوری دنیا کے دانشور طبقہ کو اپنا گرویدہ بنا لیا تھا۔ بالخصوص دلت اور قبائلی ادب کے حوالے سے تو وہ عالمی سطح پر اپنی شناخت مستحکم کر چکی تھیں۔ انہیں اپنے ملک میں ساہتیہ اکادمی ایوارڈ (۱۹۷۹ء) گیان پیٹھ ایوارڈ (۱۹۹۶ء) پدم شری (۱۹۸۶ء) پدم وبھوشن (۲۰۰۶ء) کا اعزاز ملا تھا جب کہ ۱۹۹۷ء میں انہیں ریمن میگسیسے ایوارڈ سے نوازا گیا تھا۔ وہ ایک بڑی ادیبہ ضرور تھیں، لیکن اس سے بھی بڑی وہ ایک مخلص انسان دوست تھیں۔ ان کا مذہب انسانیت تھا اور وہ ہمیشہ تحفظ انسانیت کے لئے سرگرم رہیں۔ ان کی تخلیقات ان کے تصور زیست کا سرمایہ ہیں اور ان کا تصور زیست دم توڑتی انسانیت کو روح بخشتا تھا، جیسا کہ انہوں نے اپنے ایک انٹرویو میں کہا تھا:

> ''ایک لمبے وقت سے میرے اندر قبائلی سماج کے لئے درد کی جو چنگاری بھڑک رہی ہے وہ میری چتا کے ساتھ ہی خاموش ہوگی۔''

۲۸ جولائی ۲۰۱۶ء کو وہ چنگاری واقعی خاموش ہوگئی، مگر ان کے افکار و نظریات کا چراغ تا دیر روشن رہے گا اور دلت، قبائل اور محرومین طبقے کے لئے مشعل راہ بنا رہے گا۔

بنگالی زبان میں افسانوی ادب

''بنگالی زبان میں افسانوی ادب کے رواج پانے سے پہلے دو تصانیف قابل ذکر ہیں۔ ان میں سے ایک پیارے چند مترا کی تصنیف ''الالر گھارر دلال'' (بڑے گھرانے کا لاڈلا بیٹا) ہے جس میں کلکتہ کے قرب و جوار میں رہنے والے ایک متوسط طبقے کی گھریلو اور سماجی زندگی کی تصویر پیش کی گئی ہے۔ مدھوسودن دت کے بعد بنگالی ادب میں پہلا بڑا نام بنکم چند چٹرجی کا ہے، جنہوں نے ''درگیش نندنی'' ۱۸۶۵ء میں لکھا۔ چٹرجی کے معاصرین اور مقلدین میں تارک ناتھ گنگولی اور رمیش چندر دت کی خدمات اہم یادگار ہیں۔ چندر دت نے چار تاریخی ناول اور گھریلو رومانس لکھے ہیں، پھر انیسویں صدی کے آخر سے بیسویں صدی تک ٹیگور گھرانے کی خدمات بھی نمایاں رہیں۔ بلا شبہ اس خاندان کی کئی نسلوں کا بنگال کی نشاۃ ثانیہ میں زبردست حصہ رہا ہے۔ بنگلہ کے افسانوی ادب میں تاریخ کے موضوعات پر بھی خامہ فرسائی کی گئی ہے۔ رکھل داس بنرجی کے ناول ''کرونہ''، ''ساسن کہ''، ''دھرم پال'' اور ''سیوک'' مستند تاریخ کے اہم اچھے نمونے پیش کرتے ہیں۔ پربھات کمار مکرجی کے افسانے اور ناول بھی بڑی مقبولیت رکھتے ہیں اور پھر سرت چندر چٹرجی کا نام تو کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ ''پاتھیر چھاپ'' پہلا بنگالی ناول ہے جس میں جرائم اور جنس دونوں کو موضوع بنایا گیا ہے۔ یہ ناول جنگ عظیم اول کے بعد لکھا گیا۔ منندر لال بوس اور ببھوتی بھوشن نے بھی کامیاب ناول لکھے ہیں۔ انودا شنکر رائے کا ناول ''ستیہ ستیہ'' چھ جلدوں میں ہے۔ بنگلہ افسانوی ادب میں آزادی کے بعد جو نوجوان ادیب آئے، ان میں ناول ''جاگیری'' کے مصنف ستیہ ناتھ بھادری بہت اہم ہیں وہ گاندھی وادی تھے اور ان کا یہ ناول جیل کے تجربات پر مبنی ہے۔ (ماخوذ)

PDF Compressor Free Version

شبیر احمد

11B/1, K.B.Bose Lane, Kolkata-700033

مہاشویتا دیوی سے ایک گفتگو

ہندستانی ادب میں تین دیویاں خاصی اہمیت کی حامل رہی ہیں۔ مہادیوی ورما، آشاپرنا دیوی اور مہاشویتا دیوی۔ مہادیوی ورما کا تعلق ہندی سے جب کہ آشاپرنا دیوی اور مہاشویتا دیوی کا تعلق بنگلہ زبان سے رہا ہے۔ تینوں کو ہندستان کے سب سے بڑے ادبی انعام، گیان پیٹھ سے نوازا گیا۔ مہادیوی ورما ۸۰ سال کی عمر میں ۱۱ ستمبر ۱۹۸۷ء کو اور آشاپرنا دیوی، ۸۶ سال کی عمر میں ۱۳ جولائی ۱۹۹۵ء کو اس دارفانی سے پہلے ہی کوچ کر چکی تھیں۔ اب باری مہاشویتا دیوی کی تھی جو ۲۸ جولائی ۲۰۱۶ء کو آنجہانی ہوگئیں۔ موت کے وقت وہ نوے سال کی تھیں۔ انھوں نے ''ہزار چوراسی کی ماں''، ''رودالی'' اور ''ارنیر ادھیکار'' جیسی کہانیاں لکھیں۔ ان کی کہانیوں پر ہندی، بنگلہ، مراٹھی اور اطالوی زبانوں میں کئی فلمیں بھی بنائی گئیں۔ وہ ایک عظیم فکشن نگار ہی نہیں، ایک عظیم شخصیت کی مالک بھی تھیں۔ وہ شوشیل اکٹویسٹ بھی تھیں۔ غریبوں اور نچلے طبقے کے لوگوں کے حقوق کی پاسداری کے لیے ہمیشہ سرگرداں رہیں۔ بایاں محاذ حکومت کی صنعتی پالیسی کے خلاف محاذ کھول دیا۔ جب حکومت نے غریب کسانوں سے زرخیز زمین کوڑیوں کے دام بزور چھین کر صنعت کاروں کو فروخت کرنے کی پالیسی اپنائی تو مہاشویتا دیوی نے غریب کسانوں کے حق میں تحریک شروع کردی۔ ۲۰۱۱ء کے انتخاب میں انھوں نے ممتا بنرجی کی حمایت کی اور نتیجہ کے طور پر چونتیس سالہ بایاں محاذ حکومت کا خاتمہ ہوگیا۔ ایسی آہنی ارادے والی ''دیوی'' اب نہیں رہی۔ مجھے خوشی ہے کہ مجھے اس ''دیوی'' سے گفتگو کرنے کا شرف حاصل ہوا تھا۔ اس گفتگو کا کچھ حصہ حاضر خدمت ہے۔

شبیر احمد: مہاشویتا دیوی آج ملک کا ایک بڑا نام ہے۔ ادبی اور سماجی خدمات کے عوض بہت سارے انعامات پا چکی ہے۔ ساہتیہ اکادمی ایوارڈ، گیان پیٹھ ایوارڈ، Ramon Magsaysay ایوارڈ، پدما شری، پدما بھوشن، بنگا بھوشن، ساہتیہ برہما ایوارڈ اور نہ جانے کیا کیا کچھ۔ اس کے ناولوں پر بڑی بڑی فلمیں بنی ہیں۔ آج اس بلندی سے جب وہ اپنے ماضی کی طرف دیکھتی ہے تو اسے کیا نظر آتا ہے؟

مہاشویتا دیوی: ایک چھوٹی سی بچی۔ ماں کی گود میں مچلتی ہوئی، باپ کی بانہوں میں جھولتی ہوئی ایک نٹ کھٹ بچی۔ آج مہاشویتا کو لوگ ''دیوی'' کہتے ہیں، اسے ''دیوی'' بنانے میں سب سے بڑا ہاتھ اس کے ماں باپ کا ہے۔ اس کنبے کا ہے جس میں وہ پیدا ہوئی، پلی بڑھی۔ میری ننھیال اور ددھیال دونوں جگہ ایسی ایسی شخصیتیں موجود تھیں جو اپنی مثال آپ تھیں۔ وہ آزادی کی تحریکوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی تھیں۔ میرے نانا، دادا، ماما، چاچا، سبھی آزادی کے سپاہی تھے۔ میری نانی عورتوں کی تعلیم کے سلسلے میں پیش پیش رہتی تھیں۔ نانا وکیل تھے، ایک غریب وکیل۔ غریب اس لیے کہ وہ اکثر آزادی کے سپاہیوں کے کیس لڑا کرتے تھے اور فیس نہیں لیتے تھے، یا پھر لیتے تھے تو برائے نام۔ نانا جب کچہری چلے جاتے تو نانی پاس پڑوس کی اَن پڑھ عورتوں اور لڑکیوں کو اپنے گھر بلاتیں اور انھیں پڑھایا کرتی تھیں۔ شادی سے پہلے میری ماں بھی اس معاملے میں نانی کا ہاتھ بٹایا کرتی تھی۔ شادی کے بعد ماں نے اپنے سسرال میں یہ سلسلہ شروع کردیا۔ جب میں بڑی ہوئی تو میں بھی ماں کا ہاتھ بٹانے لگی۔ اَن پڑھ بچیوں کو اپنے گھر لا کر پڑھاتی اور بنیادی تعلیم کے بعد انھیں کسی اسکول میں لے جا کر داخل کرا دیتی۔ بڑھاپے میں ماں اندھی ہوگئی تھی، مگر بچیوں کو پڑھانا نہیں چھوڑا۔ بچیوں کی پیٹھ پر انگلیاں پھیر کر انھیں لکھنا سکھاتی تھی۔ میرے لیے نانی اور ماں کی یہ خدمات میل کا پتھر ثابت ہوئی۔ میں ان کے بتائے ہوئے راستے پر

PDF Compressor Free Version

گامزن ہوئی اور آج تک گامزن ہوں۔

شبیر احمد: یعنی انسانی خدمات کا جذبہ آپ کو ورثے میں ملا ہے۔ آپ کی باتیں سن کر آپ کے کنبے کے بارے میں مزید جاننے کی دلچسپی پیدا ہو رہی ہے۔

مہاشویتا دیوی: بھئی، ہمارے کنبے میں بڑے بڑے دلچسپ واقعات رونما ہوتے رہے ہیں۔ سب سے دلچسپ واقعہ یہ ہے کہ ہمارے یہاں ایک گائے تھی جو گھانس پھوس کے مقابلے گوشت مچھلی کھانا پسند کرتی تھی۔ آپ اسے ہندستان کی واحد Non-veg گائے کہہ سکتے ہیں۔ جب تک چارے کے ساتھ مرغ اور مچھلی نہیں دی جاتی تھی، وہ چارے کو منھ نہیں لگاتی تھی۔ اس کے اوصاف شیر جیسے تھے۔ چیتے کی مانند دوڑتی تھی۔ تندوے کی طرح چھلانگ لگاتی تھی اور تو اور علم حاصل کرنے کا بھی اسے بڑا شوق تھا۔ موقع پاتے ہی (قہقہہ لگاتے ہوئے) میرے بھائی بہنوں کی کتاب کاپیاں چبا جاتی تھی۔

شبیر احمد: آپ کے بابا اسے ڈانٹتے نہیں تھے؟

مہاشویتا دیوی: میرے بابا! میرے بابا اسے کیا ڈانٹتے! وہ تو اس کی ان خوبیوں پر فخر کیا کرتے تھے۔ اور ہاں، بابا سے متعلق ایک اور دلچسپ واقعہ سنئے۔ بابا اسکاچ پیا کرتے تھے۔ اچانک ایک دن اعلان کیا کہ آج سے شراب کو ہاتھ نہیں لگاؤں گا۔ ہم سب خوش تھے کہ بابا کی یہ لت چھوٹی۔ ڈھاکہ میں ہمارا مکان ایک منزلہ تھا۔ چھت پر گائے کا چارہ (پوال) رکھا رہتا تھا۔ گائے چھت پر چڑھ کر چارہ کھا جایا کرتی تھی۔ ایک دن چارہ کھا کر جھومنے لگی۔ ہم اسے نیچے اتارنے کی کوشش کر رہے تھے، مگر وہ تھی کہ اترنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ بار بار چارے کی طرف بڑھتی جا رہی تھی۔ جھومتی ہوئی، آنکھیں مٹکاتی ہوئی۔ ہم جب چارے کے قریب پہنچے تو دیکھا اسکاچ کی بوتل ٹوٹی پڑی ہے اور چارے سے شراب کی بو آ رہی ہے۔ یعنی بابا چھپ چھپ کر پیتے تھے اور بوتل چارے کی ڈھیر میں چھپائے رکھتے تھے۔ اس واقعہ سے یہ ہوا کہ اب تک ہمارے گھر میں ایک شرابی تھا (قہقہہ لگاتے ہوئے)، اب دو ہو گئے۔ ہمارے گھر میں روزانہ کوئی نہ کوئی دلچسپ واقعہ ضرور رونما ہوتا تھا۔ بڑا زندہ دل کنبہ تھا ہمارا۔

شبیر احمد: آپ کے بابا کرتے کیا تھے؟

مہاشویتا دیوی: انکم ٹیکس افسر تھے۔ ان کا نام منیش گھٹک تھا۔ آپ نے ان کا نام نہیں سنا؟ آپ کیسے سنیں گے؟ آپ کی عمر ہی کیا ہے۔ یہ بات آزادی سے پہلے کی ہے۔ میرے بابا اپنے وقت کے بڑے اچھے شاعر تھے۔ وہ ادیب بھی تھے۔ انھوں نے کئی ناول بھی لکھے ہیں۔ "جو بنا شوا" کے نام سے لکھا کرتے تھے۔ میری ماں دھارتری دیوی بھی ایک ادیبہ تھی۔ اور آپ نے نام سنا ہے "Ritwik Ghatak" کا؟

شبیر احمد: وہ مشہور فلم ساز!

مہاشویتا دیوی: ہاں، وہ میرے سگے چاچا تھے۔ آج تک فلم سازی میں ان کا کوئی ثانی نہیں۔

شبیر احمد: چلئے یہ تو معلوم ہو گیا کہ آپ کا کنبہ ادیب و فنکار کا کنبہ ہے۔

مہاشویتا دیوی: صرف ادیب و فنکار کا نہیں، صحافیوں کا بھی کنبہ ہے۔ میرے ماما سنکھو چودھری معروف سنگ تراش تھے۔ دوسرے ماما سچن چودھری "Economic andPolitical" Weekly کے Founding Editor تھے۔ بمبئی میں رہتے تھے۔ ایک بار میں بمبئی گئی۔ انھی کے گھر میں پہلی بار مجھے ۱۸۵۷ء کی بغاوت پر ایک کتاب پڑھنے کا موقع ملا۔ جھانسی کی رانی کے کردار سے اس قدر متاثر ہوئی کہ میں نے اس پر قلم اٹھانے کا ارادہ کیا۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ یہیں سے میری ادبی زندگی کی اصل شروعات ہوئی۔

شبیر احمد: یہ واقعہ کب کا ہے؟ کیا آپ نے اس سے پہلے کچھ لکھا نہ تھا۔

مہاشویتا دیوی: یہ ۱۹۵۱-۵۲ء کا واقعہ ہے۔ میں اس وقت پچیس چھبیس سال کی رہی ہوں گی۔ میرا ناول "جھانسی رانی" (جھانسی کی رانی) ۱۹۵۶ء میں شائع ہوا تھا۔ اس سے پہلے میں نے دو چار افسانے لکھے تھے جو اِدھر اُدھر رسالوں میں چھپ چکے تھے، مگر "جھانسی رانی" کی مقبولیت نے مجھے ایسی تقویت پہنچائی کہ میں نے باضابطہ طور پر ادب تخلیق کرنا شروع کر دیا۔

شبیر احمد: مجھے جہاں تک علم ہے آپ نے اس ناول میں

PDF Compressor Free Version

اپنی ایک الگ راہ نکالی تھی۔ خاص قسم کا مواد فراہم کیا تھا جو اس سے قبل ہندستانی ناولوں میں فراہم نہیں کیا گیا تھا۔ بنگلہ کے کسی ناول نگار مثلاً ربندر ناتھ، شرت چندر، تارا شنکر، بھوتی بھوشن، مانک بندھو پادھیائے کسی نے نہیں کیا تھا۔ اور کیا بھی تھا تو ضمنی طور پر۔

مہاشویتا دیوی: آپ نے ٹھیک کہا۔ میں نے اس ناول میں پہلی بار Folk Materials کا بڑے پیمانے پر استعمال کیا اور اس کے لیے مجھے دربدر بھٹکنا پڑا۔ کبھی بندیل کھنڈ، کبھی جھانسی، کبھی بڑودہ، کبھی احمد آباد، اور کبھی دور دراز قصبوں اور گاؤں میں۔ میں رانی جھانسی کے رشتہ داروں سے ملی۔ جہاں سے جتنا مواد ملا، اکٹھا کیا۔ رانی کے بارے میں بہت سارے Folk Songs دستیاب تھے، جن میں پیشواؤں اور رانی کے کارناموں کے مختلف قصے نظم کیے گئے تھے۔ انھیں مراٹھی میں "راسو" کہتے ہیں۔ اس دوران میں مراٹھی کے مشہور شاعر بھوشن کے راسو کا بھی مطالعہ کیا۔

شبیر احمد: اس کا مطلب ہے کہ آپ نے اس تاریخی ناول کو لکھنے میں کتاب کے بدلے لوگوں کے حافظے میں محفوظ مواد پر زیادہ بھروسہ کیا۔

مہاشویتا دیوی: آپ نے بالکل درست فرمایا۔ میرا یہ ماننا ہے کہ تاریخ کے قیمتی اور قابل اعتبار مواد وہ ہیں جو عام آدمی کے حافظے میں محفوظ ہیں، نہ کہ کتابوں اور دستاویزوں میں۔ آپ کو شاید پتہ نہیں یہ عام آدمی ہی ہیں جو اپنے Heros کے کارناموں کے قصے اپنے ذہن میں سنبھال کر رکھتے ہیں، ورنہ مورخ تو اکثر اپنے سیاسی آقاؤں کے اشاروں پر انھیں مسخ کر دیتے ہیں۔

شبیر احمد: آپ نے ٹھیک فرمایا، میڈم۔ یہی قصے جو ہماری اساطیر کی بنیاد ہیں، شکلیں بدل بدل کر ہمارے افسانوں، ناولوں میں در آتے ہیں اور یہ سلسلہ چلتا رہتا ہے، مگر ہمیں آپ سے ایک اور اہم قصہ سننا ہے اور قصہ ہے Bijanda سے آپ کی شادی کا۔ Bijan Bhattacharya ڈراما کی دنیا میں ایک بہت بڑا نام ہے۔ ڈراما لکھتے بھی تھے، اسٹیج بھی کرتے تھے اور اداکاری بھی۔

مہاشویتا دیوی: ہاں وہ تو India People's Theatre Association(IPTA) کے بانیوں میں تھے۔ سچے اور پکے کمیونسٹ تھے۔ ماں باپ نے ان سے میری شادی کرادی اور میں نے کر لی۔ حالاں کہ وہ مجھ سے کافی سینئر تھے۔ بارہ تیرہ سال بڑے تھے۔ لوگ ان کے ڈراموں پر تبصرے کیا کرتے تھے اور میں اس وقت ایم اے میں پڑھتی تھی۔ اتنے بڑے ڈراما نگار سے میری شادی ہوگئی۔ میں خوش تھی۔ شادی کے بعد میری زندگی کا ایک نیا باب شروع ہوا۔ سبھی لڑکیوں کی زندگی میں شادی کے بعد نیا باب شروع ہوتا ہے، لیکن میری زندگی کا یہ بالکل ہی نیا باب تھا۔ جیسا کہ میں نے بتایا، بجن ایک سچے کمیونسٹ تھے اور اُس وقت کے سچے کمیونسٹوں کے پاس سب کچھ ہوتے تھے، مگر پیسے نہیں۔ وہ صبح سویرے نکلتے تھے اور دیر رات لوٹتے تھے۔ غربت کیا ہوتی ہے۔ مجھے پتہ نہیں تھا۔ میں ایک خوش حال گھرانے سے تھی، پھر بھی اپنی نئی زندگی کو خوش آمدید کہا۔ ۱۹۴۸ء میں Nabrun پیدا ہوا۔ آپ تو جانتے ہیں، Bhattacharya Nabrun کو؟

شبیر احمد: ہاں، میڈم، نورون دا کو کون نہیں جانتا۔ اتنے بڑے ادیب ہیں، مگر سنتے ہیں کہ ماں بیٹے میں کچھ اَن بن رہتی ہے۔

مہاشویتا دیوی: کچھ نظریاتی اَن بن ہے، خیر چھوڑیے ماں بیٹے کی ان بن کو۔ ہاں، تو میں کہہ رہی تھی..... دیکھیے بھول گئی۔ بڑھاپے کی وجہ سے مجھے آج کل بھولنے کی بیماری ہوگئی ہے۔

شبیر احمد: آپ کہہ رہی تھیں بجندا سے آپ کی شادی ہوئی اور.....

مہاشویتا دیوی: بجن سے شادی کے بعد میری زندگی میں انقلاب آ گیا۔ معاشی اور سیاسی انقلاب دونوں ایک ساتھ۔ گھر میں اناج کا ایک دانہ نہیں ہوتا تھا۔ کئی کئی دن تک فاقے کرنے پڑتے تھے۔ میرے ماں باپ چاہتے ہوئے بھی مدد نہیں کر سکتے تھے۔ انھیں پتہ تھا کہ میں بے حد حساس ہوں۔ کہیں میری انا کو چوٹ نہ پہنچے، اس لیے وہ بھی غم کھا کر رہ جاتے تھے۔ سچ کہوں تو، اگر میں نے یہ غربت نہیں جھیلی ہوتی، فاقے نہیں کیے ہوتے، اپنے بیٹے کو بھوک سے روتا بلکتا نہ دیکھا ہوتا تو شاید میرے اندر وہ عورت بیدار نہ ہوئی ہوتی جسے آپ سب مہاشویتا دیوی کے نام سے جانتے ہیں۔

شبیر احمد: آپ اور بجندا شادی کے بندھن میں

PDF Compressor Free Version

بندھے۔ ۱۹۴۸ء میں آپ کے بیٹے کی پیدائش ہوئی، مگر کچھ عرصہ بعد آپ دونوں میں طلاق ہوگئی۔ اس کی وجہ کیا تھی؟

مہاشویتا دیوی: کچھ عرصہ بعد نہیں بارہ تیرہ سال بعد۔ ہم دونوں نے علاحدگی کا فیصلہ کیا اور علاحدہ ہوگئے۔ اس بارے میں مزید کچھ کہنا مناسب نہیں۔ میں بجن کی عزت کرتی ہوں۔ وہ بھی میری عزت کرتے ہیں، بس۔ ساتھ رہنا نہ رہنا ذاتی معاملہ ہے۔

شبیر احمد: اچھا میڈم، شادی کے بعد آپ ڈھاکہ سے یہاں چلی آئیں اور.....

مہاشویتا دیوی: نہیں نہیں، میں شادی کے بعد ڈھاکہ سے یہاں نہیں آئی۔ جیسا کہ میں نے بتایا میرے بابا انکم ٹیکس افسر تھے، اس لیے ان کا تبادلہ مختلف جگہوں پر ہوا کرتا تھا۔ لہٰذا مجھے ربندر ناتھ ٹیگور کے اسکول میں داخل کرادیا گیا۔ ڈھاکہ میں ساتویں جماعت تک پڑھی۔ اس کے بعد شانتی نکیتن میں پڑھنے لگی۔ گرودیو اس وقت زندہ تھے۔ مجھے ان سے بہت کچھ سیکھنے سمجھنے کا موقع ملا۔ اس لحاظ سے میں واقعی بہت خوش نصیب ہوں، لیکن میری اس زندگی کا تعلق اُس زندگی سے قطعی نہیں۔ وہ زندگی جہاں سب کچھ میسر تھا اور یہ زندگی جہاں کچھ بھی نہیں تھا، سوائے غربت اور لاچاری کے۔ اگر میں خود اس مرحلے سے نہ گزرتی تو شاید ان لاکھوں غریب قبائلیوں کی لاچاری اور بے بسی نہیں سمجھ پاتی۔

شبیر احمد: آپ کی شادی ۱۹۴۶ء میں ہوئی۔ اس کا مطلب ہے ہندستان کے بٹوارے کی دشواریوں سے آپ بخوبی واقف ہوں گی۔ اردو فکشن میں بٹوارے کے مسائل پر بہت کچھ لکھا گیا ہے، مگر ان سب کا تعلق شمال مغربی ہندستان سے ہے۔ اردو فکشن میں مشرقی ہندستان (بنگال) کے بارے میں شاذ ہی لکھا گیا ہے۔ قرۃ العین حیدر کی تحریروں میں تھوڑے بہت حوالے ملتے ہیں۔ کیا آپ نے اس مسئلے پر کچھ لکھا ہے؟

مہاشویتا دیوی: پنجاب اور سندھ کی طرح یہاں کوئی ایسا مسئلہ کھڑا نہیں ہوا، اس لیے میں نے اسے اس زاویے سے نہیں دیکھا۔ نہ ہی اپنی تحریروں میں اسے برتنے کی کبھی شعوری کوشش کی۔ بنگال کے دوسرے ناول نگاروں نے تھوڑا بہت برتا ہے جن میں پرفلا رائے، سمریش باسو، اتین بندھوپادھیائے اور سنیل گنگوپادھیائے وغیرہ شامل ہیں۔

شبیر احمد: آپ کی تحریروں کے بارے میں ناقدین کیا کہتے ہیں؟

مہاشویتا دیوی: ناقدین! (مسکراتے ہوئے) یہ کس بلا کا نام ہے؟

شبیر احمد: کیوں؟ بنگلہ ادب میں ناقدین نہیں ہیں؟

ہمارے یہاں تو ناقدوں کا دور دورہ ہے۔

مہاشویتا دیوی: بنگلہ ادب پہلے کبھی ناقدوں کے شکنجے میں تھا اور نہ آج ہے۔ شاید اسی لیے ہمارا تخلیقی ادب کا دھارا اتنا رواں دواں ہے۔ ہم ادب قارئین کے لیے لکھتے ہیں، ناقدوں کے لیے نہیں۔ اب رہی قارئین کی بات تو قارئین دو طرح کے ہو سکتے ہیں۔ عام قاری اور ذہین قاری۔ اگر کوئی شخص خود کو ناقد کہتا ہے اور کسی فن پارے پر انگلی اٹھانا چاہتا ہے تو اسے چاہئے کہ سب سے پہلے وہ اس فن پارے سے بہتر کوئی فن پارہ تخلیق کرے پھر لوگ خود بخود اس کی باتیں مان لیں گے۔ کیوں کہ Example is always better than precept اب رہی آپ کے اردو ادب کی بات تو آپ کے یہاں کیا ہو رہا ہے اس کا مجھے علم نہیں۔ اگر آپ کے یہاں ناقدین کا دور دورہ ہے تو یہ بڑی تشویش کی بات ہے اور میں سمجھتی ہوں کہ اس میں سارا قصور تخلیق کاروں کا ہے کہ انھیں اپنے قلم سے زیادہ ناقدوں کی رائے پر بھروسہ ہے۔ ایسے لوگوں کو ناقدوں کے چنگل سے نکالنا دشوار ہے۔

شبیر احمد: اچھا آپ اردو ادب کے بارے میں کیا رائے رکھتی ہیں؟

مہاشویتا دیوی: جہاں تک اردو ادب کے مجموعی جائزے کا تعلق ہے تو میں یہ کہوں گی کہ اردو ادب کا ماضی بڑا شاندار رہا ہے۔ جہاں میرؔ اور غالبؔ جیسے شاعر پیدا ہوئے، جہاں منٹو اور قرۃ العین حیدر جیسے فکشن نگار موجود ہیں، اس ادب کو تو Rich ہونا ہی ہے۔

شبیر احمد: اردو کے کون کون سے ادیبوں اور شاعروں سے آپ کے مراسم رہے ہیں؟

مہاشویتا دیوی: میں قرۃ العین حیدر کو جانتی تھی۔ خواجہ احمد عباس سے میری ملاقات تھی۔ بنگال میں وحشتؔ اور پرویزؔ شاہدی کو

PDF Compressor Free Version

پہچانتی تھی اور بھی بہتوں سے ملی ہوں میں ان کا نام بھول رہی ہوں، ویسے بھی مجھے بھولنے کی بیماری ہوگئی ہے۔ میں اردو زبان سے زیادہ واقف نہیں، مگر اس کی شاعری دل کے دامن کو کھینچتی ہے۔

شبیر احمد: ہندستانی ادب میں تین دیویاں ہیں۔ دو بنگلہ کی اور ایک ہندی کی۔ تینوں اعلیٰ پائے کی ہیں۔ تینوں گیان پیٹھ انعام یافتہ.....

مہاشویتا دیوی: سنئے، عورتیں کسی میدان میں مردوں سے پیچھے نہیں۔ ان تین دیویوں نے ثابت کر دکھایا ہے (مسکراتے ہوئے) کہ ادب ہو یا سیاست، جنگ ہو یا امن، عورت ہر جگہ موجود ہے، کیوں آپ کے یہاں قرۃ العین حیدر نہیں۔ انھیں بھی تو گیان پیٹھ انعام ملا ہے، مگر آپ کا مطلب نام سے ہے تو ہاں، ادب میں تین عورتیں ہیں جن کے نام کے ساتھ دیوی جڑا ہے، مگر یہ تیسری دیوی ان دونوں دیویوں سے جونیئر ہے۔ وہ دونوں مجھ سے بڑی تھیں۔ عمر میں بھی اور تخلیقی صلاحیتوں میں بھی۔ آشاپورنا دیوی بنگلہ کی بہت بڑی فکشن نگار تھیں۔ انھیں ۱۹۷۶ء میں گیان پیٹھ ملا تھا۔ مہادیوی ورما ہندی کی بہت بڑی شاعرہ تھیں۔ انھیں ۱۹۸۲ء میں گیان پیٹھ ملا تھا، لیکن میں تو ایک معمولی ادیبہ ہوں، پتہ نہیں کیسے مجھے ۱۹۹۶ء میں یہ انعام دے دیا گیا۔ آپ نے یہ تین دیویوں والا اچھا نکتہ نکالا ہے۔ میں نے کبھی اس انداز سے سوچا ہی نہیں تھا۔

شبیر احمد: اچھا، آپ قبائلیوں کی جانب متوجہ کیسے ہوئیں؟ آپ تو Bijaygarh College, Calcutta میں انگریزی کی لکچرر مقرر ہو چکی تھیں۔ ایک Established ناول نگار بن گئی تھیں۔

مہاشویتا دیوی: صرف یہی نہیں، میں صحافت سے بھی جڑ گئی تھی، مگر اس سے پہلے میں ایک سرکاری دفتر میں ملازم تھی، لیکن میرے دشمنوں کی کمی نہیں تھی۔ انھوں نے میرے ڈراور میں مارکس اور انجلس کی کتابیں رکھ کر مجھ پر کمیونسٹ ہونے کا الزام لگایا اور مجھے دفتر سے نکال دیا گیا۔ اس وقت کمیونسٹ پارٹی کو غیر قانونی ادارہ سمجھا جاتا تھا۔ سچ پوچھئے تو نہ میں کبھی کمیونسٹ تھی اور نہ آج ہوں۔ آج کل تو ہمارے کامریڈوں نے کمیونزم کا نظریہ ہی بدل دیا ہے۔ اب تو وہ اے سی کار میں گھومتے ہیں۔ ائیر کنڈیشنڈ بنگلوں میں رہتے ہیں۔ بیرون ممالک کی سیر کرتے ہیں۔

شبیر احمد: آپ نے قبائلیوں کے بارے میں لکھنا کیسے شروع کیا؟

مہاشویتا دیوی: مجھے سیر و سیاحت کا بہت شوق تھا۔ اِدھر اُدھر گھوما کرتی تھی۔ ایک بار بہار کے ضلع پلاموں گئی۔ وہاں کچھ دنوں تک رہنے کا موقع ملا۔ وہاں Dead Bounded Labour System دیکھا۔ کلیجہ منھ کو آ گیا۔ قبائلیوں کو ایک ہزار روپے قرض دیا گیا۔ ادا نہ کرنے کی صورت میں ان کے گھر اور زمین مہاجنوں نے ہڑپ لیے۔ ان پر مظالم ڈھانے لگے۔ انھیں بندھوا مزدور بنا لیا۔ اس غیر انسانی فعل سے میرا دل دہل گیا۔ میں بڑی فکرمند ہوئی۔ میں نے اس سسٹم کے خلاف اخباروں میں لکھنا شروع کیا۔ دہلی گئی وہاں بھی لکھا، لیکن یہ لوگ بڑے بے حس ہیں، صرف بڑی بڑی باتیں کرتے ہیں، غریبوں کا کوئی پرسانِ حال نہیں۔

شبیر احمد: اب تک آپ نے کن کن قبائلیوں کے بارے میں لکھا ہے؟

مہاشویتادیوی: ضلع مدناپور (مغربی بنگال) کے لودھا، ضلع پورولیا (مغربی بنگال) کے گھیریا اور سانبھر، ضلع بیربھوم (مغربی بنگال) کے دھیکارا کے بارے میں لکھا ہے اور بھی بہت سارے قبائل ہیں جن کے نام فی الحال ذہن میں نہیں آ رہے ہیں۔ بودھن شوبر کو پولیس نے مار ڈالا تھا۔ میں ہائی کورٹ تک گئی۔ بنگال اور مرکزی حکومتوں کے خلاف کیس لڑا۔ کیس جیت گئی۔ اس طرح غریب قبائلیوں کی حمایت میں میں نے بہت سارے کیس لڑے ہیں۔ مختلف پلیٹ فارموں سے آوازیں اٹھائی ہیں۔ ان کے خلاف ہونے والے ظلم کو اپنے ناولوں اور افسانوں میں پیش کیے ہیں۔

شبیر احمد: بنگلہ میں شرت چندر اور اردو ہندی میں پریم چند دونوں اہم فکشن نگار ہیں، آپ کسے بڑا مانتی ہیں؟

مہاشویتا دیوی: دیکھئے ادب میں کوئی بڑا چھوٹا نہیں ہوتا۔ ہر ادیب کی اپنی انفرادیت ہوتی ہے۔ اپنا رول ہوتا ہے۔ شرت چندر اور پریم چند دونوں ہی دبے کچلے طبقے کو دیکھ کر فکرمند ہوتے تھے۔

PDF Compressor Free Version

دونوں ہی نے زمیندارانہ نظام کی برائیوں کو اجاگر کیا ہے، لیکن یہ بات بہر حال اپنی جگہ مسلم ہے کہ شرت چندر نے کرداروں کی جتنی جہتیں پیش کی ہیں، پریم چند نہیں کر پائے ہیں۔ موضوعات کے لحاظ سے بھی شرت کی تحریروں میں زیادہ وسعت ملتی ہے۔ میں یہ اس لیے نہیں کہہ رہی ہوں کیوں کہ میں بنگالی ہوں۔ میں مجموعی طور پر کہہ رہی ہوں۔

شبیر احمد: کیا آپ کبھی کسی ادبی تحریک سے وابستہ ہوئی ہیں؟

مہاشویتا دیوی: نہیں میں تحریکوں کے جھمیلے میں نہیں پڑتی ہوں۔ ترقی پسندی، جدیدیت، مابعد جدیدیت، سب اپنی جگہ اور میں اپنی جگہ۔ ہاں میرے شوہر بجن بھٹا چاریہ بائیں تحریک سے جڑے ہوئے تھے، لیکن میں کبھی نہیں جڑی۔

شبیر احمد: کیا ادیبوں اور شاعروں کو سیاسی چھتر چھایا میں رہنا چاہئے؟ آپ کی کیا رائے ہے؟

مہاشویتا دیوی: نہیں، بالکل نہیں۔ آزاد خیالی شاعروں اور ادیبوں کا سب سے بڑا سرمایہ ہے۔ آپ کو پتہ ہے۔ مجھے اس حکومت نے بنگلہ اکاڈمی کا چیئر پرسن بنایا تھا، لیکن میں ان کے اصولوں سے سمجھوتہ نہ کر سکی اور میں نے استعفیٰ دے دیا۔ یہ حال ہی کی بات ہے۔

شبیر احمد: ٹکنالوجی کی دن بدن ترقی ہو رہی ہے اور قاری کی تعداد گھٹتی جا رہی ہے۔ اگر ایسا ہوتا رہا تو ادب کا مستقبل خطرے میں پڑ جائے گا۔ آپ کی اس بارے میں کیا رائے ہے؟

مہاشویتا دیوی: ادب کو کوئی خطرہ نہیں ہو سکتا۔ یہ ممکن نہیں۔ ربندر ناتھ، شرت چندر، پریم چند، نذر لاسلام اور غالب کو ہم سے کوئی نہیں چھین سکتا۔ انھیں نہیں پڑھیں گے، ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔ ان کی تحریریں دیکھیں گے یا سنیں گے تو کھنچے چلے آئیں گے۔ ٹکنالوجی جتنی ترقی کر لے، وہ ادب کی جگہ نہیں لے سکتی۔

شبیر احمد: آپ کو اپنی تحریروں میں سب سے زیادہ کیا پسند ہے.....؟

مہاشویتا دیوی: ''چوٹی منڈا اابنگ تار تیر'' (چوٹی منڈا اور اس کا تیر) اس کے علاوہ ''آرنیر ادھیکار'' (جنگل کا حق) ''اگنی گربھا'' وغیرہ مجھے بہت پسند ہیں۔

شبیر احمد: اور ''ہزار چوراسی ماں'' (ہزار چوراسی کی ماں)؟ اس پر تو گووند نہالانی صاحب نے فلم بھی بنائی ہیں اور اسے انعام سے بھی نوازا گیا؟

مہاشویتا دیوی: (ہنستے ہوئے) فلم بنی ہے، انعامات ملے ہیں، لیکن وہ تحریر اتنی بڑی نہیں جتنا بڑا اسے بنا دیا گیا ہے۔ دراصل اس وقت نکسل تحریک اور قبائلی انقلاب کے موضوعات پر ناول نہیں لکھے جاتے تھے۔ اس لیے میرا یہ ناول اس قدر مشہور ہو گیا۔

شبیر احمد: مہاشویتا دیوی نے بہت کچھ لکھا، بہت کچھ کیا۔ اب وہ کیا کرنا چاہتی ہے؟

مہاشویتا دیوی: بچوں کے لیے کہانیوں کا مجموعہ۔ آپ تو جانتے ہیں بنگلہ ادب میں بچوں کا ادب کس قدر Rich ہے۔ Variety بھی بہت ہے، اس لیے میں ان کہانیوں کا ایک مجموعہ ترتیب دینا چاہتی ہوں۔ اس کے علاوہ قبائلیوں کے تہواروں کے گیتوں کا بھی ایک مجموعہ شائع کرنا چاہتی ہوں، مگر آپ تو مجھے دیکھ ہی رہے ہیں۔ ستاسی سال کی ہو گئی ہوں۔ پتہ نہیں یہ سب کر پاؤں گی بھی یا نہیں۔

شبیر احمد: میڈم، آپ سے باتیں کر کے بہت کچھ سیکھنے سمجھنے کو ملا۔ اور بھی بہت ساری باتیں تھیں، لیکن آپ تھک چکی ہیں، اس لیے اب آپ کو میں زیادہ زحمت دینا نہیں چاہتا۔ جاتے جاتے اگر آپ آج کی نئی نسل کو کوئی پیغام دینا چاہیں تو.....

مہاشویتا دیوی: نئی نسل کو پیغام! دنیا کا نظام تیزی سے بدل رہا ہے۔ میں نے بطور مہمان ۲۰۰۶ء Frankfurt Book Falr میں نے ہندستان کی نمائندگی کی تھی۔ وہاں میں نے راج کپور کی فلم کے ایک گیت کو سامنے رکھ کر اپنی تقریر میں کہا تھا: ''یہ زمانہ واقعی جاپانی جوتے، انگلستانی پتلون اور روسی ٹوپی کا زمانہ ہے، مگر دل کو چاہئے کہ ہمیشہ ہندستانی رہے۔ ایسا دل، جو غریبوں، ناداروں اور بے بسوں کے حالِ زار کو دیکھے تو تڑپ اٹھے۔ ان کی مدد کو آگے بڑھے۔ شکریہ!

☆ اصل قدر نسبت کی ہوتی ہے، نسب کی نہیں
☆ مخلوق کے ساتھ نرمی اور آسانی سے پیش آنے کا نام مدارات ہے
☆ تم کسی سے وہ برتاؤ نہ کرو جو تم اپنے لئے پسند نہیں کرتے۔

PDF Compressor Free Version

افسانے

ڈاکٹر اسلم جمشید پوری

HOD, Urdu CCS University, Meerut

سایہ فگن دھوپ

''بیٹا لو یہ خط.....اسے پڑھ کر اپنی رائے دو۔''

صبا کے والد چودھری شجاعت علی نے خط اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ صبا نے خط پڑھنا شروع کیا۔ خط خورشید صاحب کا تھا۔ انہوں نے چودھری شجاعت علی سے کھلے لفظوں میں صبا کا ہاتھ مانگا تھا۔ خط پڑھنے کے دوران صبا کے چہرے پر مختلف رنگ آتے جاتے رہے۔ خورشید صاحب اس کے ساتھ اسکول میں پڑھاتے تھے۔ ان کے دو بچے تھے، لیکن ان کی خانگی زندگی بڑے ناہموار راستوں پر چل رہی تھی۔ وہ اپنی ازدواجی زندگی سے تنگ تھے۔ ان کی بیوی گاؤں کی اکھڑ قسم کی عورت تھی، جس کا تعلیم سے دور کا بھی واسطہ نہیں تھا۔ تہذیب بھی اس کے پاس سے ہو کر نہیں گزری تھی۔ دونوں میاں بیوی میں اکثر لڑائی جھگڑے ہوتے رہتے تھے۔ تعلیم یافتہ اور مہذب خورشید صاحب کی تمام تہذیب و ثقافت اپنی بیوی کے سامنے صفر ہو کے رہ جاتی۔ ایک دن خورشید صاحب اسکول آئے تو ان کا چہرہ اترا ہوا تھا۔ لباس بھی بے ترتیب تھا۔ صبا نے خیریت دریافت کی:

''خورشید صاحب کیا بات ہے؟ خیریت تو ہے؟''

وہ جواب میں یوں گویا ہوئے: ''آج پھر لڑائی ہوگئی۔ ہوا یوں کہ میرے ایک دوست گھر آئے ہوئے تھے۔ میں نے بیوی سے چائے کے لیے کہا تو پہلے تو اس نے سنی اَن سنی کر دی۔ دوبارہ یاد دلایا تو وہ میرے دوست کے سامنے ہی چیخنے چلانے لگی۔ میرے دوستوں کو برا بھلا کہنے لگی.....بس اور کیا بتاؤں.....حد ہوگئی ہے اب.....''

خورشید صاحب کی آنکھوں کی نمی کو صاف دیکھا جا سکتا تھا۔ وہ جلدی سے پلٹے اور اپنی کلاس میں چلے گئے۔ صبا نے ان کے درد و کرب کو محسوس کیا تھا۔ ہمدردی کا ایک لطیف جھونکا اسے احساس دلاتا ہوا گزرا۔

خورشید صاحب اکثر پریشان رہتے تھے۔ ان کی صورت، ان کے اندر کی شکست و ریخت کی کہانی بیان کرتی تھی۔ ان کی افسردگی اسکول کے پورے اسٹاف پر ظاہر تھی۔ وہ اسٹاف میں بہت مقبول تھے۔ خوش شکل اور مردانہ وجاہت کا پیکر خورشید صاحب بڑے خوش اخلاق بھی تھے۔ صبا نے جب اسکول جوائن کیا تھا تو پہلے پہل اس کا دل نہیں لگتا تھا، لیکن مس فرحت، روبینہ میڈم اور خورشید صاحب کی صحبت نے اسے تنہائیوں کے ناگ سے محفوظ کر لیا تھا۔ مس فرحت سے تو اس کی قربت، دوستی کی شکل اختیار کر چکی تھی۔

ادھر کچھ دنوں سے خورشید صاحب بھی صبا میں دلچسپی لے رہے تھے اور دلچسپی کیا تھی اپنی داستانِ حیات جو غموں کا دکھڑا تھی، سناتے رہتے تھے۔ آئے دن ازدواجی زندگی کے نشیب و فراز کے واقعات کے بیان نے چٹان پر قطروں کی مسلسل یلغار کا کام کیا اور چٹان پگھلنے لگی۔ ہمدردی کا جذبہ پھیل کر صبا کے وجود پر چھا تا گیا۔ کبھی کبھی اسے ان کے حال پر رحم بھی آتا تھا۔ تعلیم یافتہ وجیہ شخص، جاہل گنوار بیوی کے پلے بندھ کر کیسا قابل رحم ہو گیا تھا۔

''بیٹا کیا ہوا؟.....خط پڑھ لیا.....''

چودھری شجاعت علی کی آواز پر ماضی کے رنگ شرما کر چھپ گئے۔ صبا ایک جھٹکے سے حال سے ٹکرائی۔ نیچی نظریں کیے ہاتھ میں خط دبائے وہ تیزی سے دوڑ کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ بستر پر دراز ہو کر آنکھیں موند لیں۔ بند آنکھوں کے پیچھے بھی خورشید صاحب کا چہرہ تمتما رہا تھا، جس سے پھوٹنے والی کرنیں اس کی زندگی کو منور کرنے کو بیتاب تھیں۔ خورشید صاحب نے اپنی شرافت اور وضع داری سے چودھری شجاعت علی کا دل جیت لیا تھا۔ گزشتہ دنوں جب چودھری صاحب پر دل کا

PDF Compressor Free Version

دورہ پڑا تھا تو انہوں نے اپنے دن رات کی تیمارداری اور خاطر تواضع سے نہ صرف چودھری صاحب بلکہ پورے گھر والوں کے دلوں پر اپنی شرافت کی مہر ثبت کر دی تھی۔ صبا گھر میں سب سے بڑی تھی، اس کے دو چھوٹے بھائی اور تین بہنیں تھیں۔ چودھری صاحب کے اس اچانک مرض نے پورے گھر کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ صبا کی والدہ کا برا حال تھا۔ صبا کے علاوہ سبھی بچے چھوٹے تھے۔ ان کے دل میں برا خیال بھی کوندا:

''اگر چودھری صاحب کو کچھ ہو گیا تو.....؟''

یہ خیال اتنا دل خراش تھا کہ اس کے آگے قیامت کے منظر کے علاوہ کچھ بھی نظر نہیں آتا تھا، ایسے میں خورشید صاحب کا اپنے بہترین اخلاق و کردار کے ساتھ گھر میں داخل ہونا، موسم خزاں میں بہار کے خوشنما جھونکے سے کم نہ تھا اور وہی ہوا جس کی امید تھی۔ چودھری صاحب کے اسپتال سے گھر آنے کے بعد خورشید صاحب کی قدر و منزلت میں اضافہ ہوتا گیا۔ چودھری صاحب اور خورشید صاحب نظریاتی طور پر ایک دوسرے کے بہت قریب آ گئے تھے۔ مختلف موضوعات پر دونوں گھنٹوں بیٹھے باتیں کرتے۔

قدرت کو شاید کچھ اور ہی منظور تھا۔ خورشید صاحب کے گھریلو معاملات روز بہ روز بگڑتے گئے۔ ان کا دن کا سکون غارت اور رات کا آرام جہنم رسید ہو گیا تھا۔ زندگی کے ایسے تپتے اور سلگتے ہوئے دنوں میں صبا ان کی زندگی میں لطیف جھونکے کی مانند داخل ہوتی گئی۔ انہیں صبا، ان کے والد اور ان کے گھر کا ماحول اپنے حصار میں محصور کرتا گیا۔

ایک دن گھریلو تنازعے سے تنگ آ کر خورشید صاحب نے دوسری شادی کرنے کا فیصلہ کر لیا اور اس کے لیے ان کی نظر انتخاب صبا پر ہی جا کر رکی، لیکن دل کے فیصلے پر دماغ نے سمجھانے کی کوشش کی۔

''بے وقوف ہو تم۔ صبا سے شادی کرو گے۔ کیا صبا بھی اس کے لیے تیار ہو گی؟ تم ایک شادی شدہ مرد ہو۔ تمہارے دو بچے بھی ہیں۔ ایسے مردوں سے جوان لڑکیاں شادی کرنا پسند نہیں کرتیں۔ ہر نوجوان لڑکی کے دل و دماغ میں کسی شہزادے کی تصویر بسی ہوتی ہے، پھر شجاعت علی تو کسی قیمت پر راضی نہ ہوں گے۔ الٹے تمہاری تیمارداری اور شرافت کو مشکوک نظروں سے دیکھا جائے گا۔''

دماغ کی باتیں حقیقت کے قریب تھیں جب کہ دل، صبا کے خوابوں میں محو تھا۔ دل و دماغ کی اسی کشمکش سے وہ کئی دن لڑتے رہے۔ بالآخر دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر انہوں نے خط کے ذریعے چودھری صاحب سے دل کا مدعا بیان کر دیا۔

چودھری شجاعت علی پر دل کا دوسرا دورہ پڑا۔ دورہ خاصا شدید تھا۔ اسپتال کا کمرہ اور سفید بستر پھر ان کے ساتھی بن گئے تھے۔ اسی دوران انہیں خورشید صاحب کا خط ملا۔ خط پڑھ کر ان پر سکتہ طاری ہو گیا۔ ایک طرف خورشید صاحب کی شرافت اور وضع داری دست بستہ کھڑی تھی۔ ایک طرف خود ان کی جان لیوا بیماری، دوسری طرف بچوں کا مستقبل اور صبا کی خوشی۔ ایسے میں وہ خود کو کشمکش کے ایسے چوراہے پر کھڑا محسوس کر رہے تھے جہاں سے کسی بھی سمت جانے کا فیصلہ وہ نہیں کر پا رہے تھے۔ پہلے پہل تو انہیں خورشید صاحب کی جرأت پر غصہ آیا، پھر وقت نے غصے پر مصلحت کا غازہ مل دیا۔ عام حالات میں وہ کبھی اپنی بیٹی کا ہاتھ کسی شادی شدہ مرد کے حوالے نہ کرتے، لیکن وقت کی نزاکت نے ان کے حالات میں تبدیلی لا دی تھی۔ خورشید صاحب نے شادی کر کے الگ رہنے کا فیصلہ کیا تھا۔ دل نے سمجھایا کوئی مضائقہ نہیں۔ دنیا کا خیال، بیٹی کی مرضی اور پھر حالات کا تقاضا، وہ ان سب میں الجھے رہے۔ بالآخر انہوں نے اپنے فیصلے میں صبا کا مشورہ لینا ضروری سمجھا اور اطمینان کا سانس لیا۔

اسپتال سے گھر آنے کے بعد چودھری شجاعت علی نے موقع دیکھ کر صبا کو خورشید صاحب کا خط ہی دے دیا اور اپنی مرضی کا اظہار تحریری طور پر مانگا۔ خط ہاتھ میں لینے اور پڑھنے کے بعد صبا کی عجب حالت تھی۔ اس کے اندر ہلچل مچی تھی۔ خورشید کی شدید تمازت نے اس کے دل کے سمندر میں تلاطم برپا کر دیا تھا۔ خورشید صاحب کی شرافت، خوش سلیقگی اور مخصوص طرز زندگی نے اس پر گہرے اثرات مرتسم کیے تھے۔ جب چودھری شجاعت علی کسی بات پر خورشید صاحب کی تعریف کرتے تو اس کا دل ایک انجانی خوشی سے معمور ہو جاتا، لیکن شادی کا فیصلہ اہم فیصلہ ہوتا ہے۔ شادی کوئی کھیل تو نہیں۔ دو نفوس کا اپنی خواہشات اور آرزوؤں کو زندگی بھر کے لیے ایک خاص دائرے میں ایک دوسرے کے

PDF Compressor Free Version

تابع کرنے کا نام شادی ہے، پھر خورشید کوئی ایسا سورج بھی نہیں جس کی روشنی پر صرف اس کا حق ہو۔اس کی روشنی پہلے ہی سے منقسم ہے۔اس سے شادی کر کے کیا میں کسی کا سورج چھین نہیں لوں گی؟ کسی کی زندگی کو اندھیروں کے حوالے کر کے اپنی زندگی میں چراغ جلانا کیا حق تلفی نہیں؟

کچھ ہی دیر بعد ایک اور خیال اسے سمجھاتا کہ خورشید صاحب کے زاویۂ نگاہ سے دیکھو، بے چارے کتنے پریشان رہتے ہیں۔ان کے تمہارے گھر والوں پر احسانات بھی تو ہیں، پھر وہ اپنی بیوی کو طلاق تو نہیں دے رہے اور تم نے خط لیتے وقت چودھری صاحب کی ملتجی نظروں کا مفہوم نہیں پڑھا تھا، پھر خورشید صاحب سے شادی کر کے تم اپنے گھر کو ایک ذمہ دار شخص عطا کرو گی جو چودھری صاحب کے بعد گھر کی ذمہ داریوں کا بوجھ بہ آسانی اٹھا سکتا ہے۔چھوٹے بھائی بہن خورشید صاحب کو کتنا پسند کرتے ہیں۔تم انہیں اپنا لو۔دونوں مل کر گھر کی گرتی ہوئی دیوار کو سہارا دیں گے۔

صبا کی منظوری کے بعد، چودھری صاحب نے خورشید صاحب کو مثبت جواب دے دیا۔بات آئی گئی ہوگئی۔وقت پرواز کرتا رہا، لیکن اس سے قبل کہ خوشی کی وہ گھڑی آتی اور سب پہ سایہ فگن ہو جاتی، چودھری شجاعت علی کے دل میں درد کا وہ طوفان اٹھا کہ اس نے زندگی کے خیمے کی ساری طنابیں اکھاڑ دیں اور وہ اپنے پیچھے بے آب و گیاہ صحرا چھوڑ گئے جہاں صبا اور اس کے گھر والے ایسے شجر تنہا کے مانند کھڑے رہ گئے جن کے پیروں تلے جلتی زمین تھی تو سر پر آگ برساتا آسمان۔ ایسے میں ان کی تمام امیدوں، آرزوؤں اور خواہشوں کا مرکز خورشید صاحب کی ذات تھی۔انہیں امید تھی کہ خورشید ان کی زندگی کی قدم قدم دھوپ میں پل پل سایہ بن کر ان کے ساتھ رہے گا۔

وقت کا دریا خاموش بہتا رہا۔چودھری شجاعت علی کی موت کو جب کئی ماہ ہو گئے اور بیگم صاحبہ عدت سے فارغ ہو گئیں تو خورشید صاحب نے بیگم صاحبہ کی خدمت میں اپنی درخواست کو دہرایا۔بیگم صاحبہ تیار ہو گئیں۔حالات کے پیش نظر طے پایا کہ نکاح خاموشی سے ہو جائے پھر بعد میں رخصتی ہو جائے گی، وہ بھی بغیر کسی شور شرابے کے۔

متعین تاریخ پر نکاح ہو گیا۔رخصتی کی تاریخ بھی طے پا گئی۔

صبا کے گھر میں تیاریاں شروع ہو گئیں۔جیسے جیسے رخصتی کا وقت قریب آ رہا تھا، صبا خوشی و غم کے ملے جلے رنگوں کے سمندر میں ڈوبتی جا رہی تھی۔چودھری شجاعت علی کی موت کا غم، ان کی یاد بن کر ہر پل ساتھ تھا۔صبا اور اس کی والدہ اکثر ایک دوسرے سے لپٹ کر رو پڑتیں۔

رخصتی کا دن قریب آتا جا رہا تھا۔تمام تیاریاں کر لی گئی تھیں۔ بہت ہی خاص رشتہ داروں کو مدعو کیا گیا تھا۔ہر انتظام میں سادگی کا خاص خیال رکھا گیا تھا۔

ادھر دو تین دن سے خورشید صاحب کا کوئی فون آیا نہ خبر۔ پتہ کیا گیا تو علم ہوا کہ شہر سے باہر کہیں گئے ہوئے ہیں۔صبا کے گھر والوں کو تشویش ہوئی۔ایک دن قبل تک خورشید صاحب کا کوئی پتہ نہ چلا۔ تشویش میں اضافہ ہوتا گیا۔اڑی اڑی خبریں مل رہی تھیں۔پتہ چلا کہ خورشید صاحب کے گھر والوں کو شادی پر اعتراض تھا۔ان کے گھر میں کافی ہنگامہ ہوا ہے۔یہ بھی علم ہوا کہ خورشید صاحب لڑائی جھگڑے سے تنگ آ کر کہیں روپوش ہو گئے ہیں۔

امیدوں کے چراغ بجھنے لگے، رخصتی کا دن بھی آ گیا، لیکن خورشید صاحب کا کہیں پتہ نہ تھا، خطرے کے پیش نظر رشتہ داروں کو ٹیلی فون کر کے پروگرام معطل ہونے کی خبر کی گئی۔جو رشتہ دار آ گئے تھے انہیں کوئی نہ کوئی وجہ بتا کر رخصت کر دیا گیا۔سارا گھر ماتم کدہ بن گیا۔ خاموشی نے لبوں پر مہریں ثبت کر دیں۔بیگم صاحبہ پر طویل بے ہوشی طاری ہو گئی تھی۔صبا کا عجب حال تھا۔وہ خاموشی کی ایسی تصویر بن گئی تھی گویا کسی جادوگر نے اسے پتھر کا بنا دیا ہو۔بالکل بے جان، جامد و ساکت۔ چھوٹے بھائی بہنوں کے چہرے سوال بن کر اس کے گرد ہالہ بنا رہے تھے۔

''کیا ہوا آپی.....؟ آپ کے خورشید کو کیا ہوا.....؟ کہاں چھپ گیا وہ.....''

صبا کشمکش میں گرفتار تھی۔طرح طرح کے خیالات دل میں سر اٹھا رہے تھے۔خودکشی کر لوں، گھر سے چلی جاؤں، لیکن کیا میری زندگی صرف مجھ تک محدود ہے۔میرے بعد ان چھوٹوں کا کیا ہوگا؟ کیا گھر کی مزید بدنامی نہیں ہوگی؟

(بقیہ ص ۵۶ پر)

PDF Compressor Free Version

فارحہ ارشد

40G, B Block Marghzaar Lahore , Pakistan

بی بانہ اور زوئی ڈارلنگ

بہت کلاسیکل پروفائل تھا بی بانہ کا، ڈکنز اور روسٹیز کے پروفائل کی مانند، اٹھارویں صدی کی روسی اور ہسپانوی صاحبزادیوں کی سی آن بان والی، یا پھر یوں جیسے چغتائی کی بنی تصویروں کے عشق بلب غزال رونقوش اور اُبھاروں میں جان پڑ گئی ہو۔ عمر خیام کی رباعیوں جتنی مے کش اور شاہ حسین کی کافیوں جیسی پرسوز اور اداس۔

اب یہ میری کچی عمر کے ماہ و سال تھے یا کیا تھا کہ ہمیشہ مجھے بی بانہ کو دیکھتے ہی بچپن میں پڑھی پریوں اور جادوگرنیوں کی کہانیاں یاد آنے لگتیں۔ کوئی داستانوی کردار، کوئی حسین جادوگرنی جس نے اپنی طلسماتی طاقت سے اپنے اردگرد بسنے والی تمام مخلوق کو اپنا گرویدہ بنا رکھا ہو۔ کسی طلسماتی محل میں جادوئی شمعیں اٹھائے کھلے گھیر والی میکسی میں یہاں سے وہاں پھرتی، بے چین روح۔

آئے روز گھر میں کسی نہ کسی بہانے محفلیں سجتیں اور بی بانہ شمع محفل بنی، بظاہر قصیدوں سے بے نیاز، مگر درحقیقت قصیدے لوٹتی۔ ساری کا پلو سنبھالتی، جب وہ ستار کے تار مخروطی انگلیوں سے چھیڑتی تو کئی انفاس کے تار ہلا کر رکھ دیتی۔ شوق کے پیش نظر سیکھی گئی موسیقی جب غزل بن کر بی بانہ کے گلے سے برآمد ہوتی تو بارش ہو نہ ہو حاضرین محفل کے دلوں پہ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا ضرور برسنے لگتی اور بی بانہ مسکراتے لبوں اور اُداس آنکھوں سے دیکھا، اَن دیکھا کئے داد سمیٹے جاتی۔ میں ایک کونے میں بیٹھی اَن دیکھی ہی رہ جاتی۔ جانے کیوں شعور سنبھالتے ہی اپنا اَن دیکھا رہ جانا برا لگنے لگا تھا، یا بی بانہ کا حد سے زیادہ نظر آنا، بس کچھ برا ضرور لگنے لگا تھا۔ میں پس پردہ بیٹھی کانوں پہ واک مین لگائے مغربی دھنوں پہ سر دھنا کرتی، تیز تیز چیونگم چبائے جاتی اور ٹانگ پہ ٹانگ رکھے ہلائے جاتی۔

آرٹسٹک انگلیاں پینٹنگ برش پکڑے جب کینوس پہ رنگ بکھیرتیں تو بی بانہ کے چہرے کا رنگ دمک اٹھتا۔ لمبی صراحی دار گردن شاہانہ انداز میں اٹھائے بی بانہ پاپا سے یوں تعریف وصول کرتی جیسے بس اسی کا حق اس تعریف پہ اور پاپا آنکھوں میں دنیا بھر کی حیرت سمیٹے تعریف کئے جاتے:

''کمال کر دیا تم نے واہ..... کیا جیتی جاگتی منظر نگاری ہے۔''

وہ پینٹنگ پہ نگاہیں جمائے یوں دیکھتے جیسے کسی نامور کلاسیک مصور کی پینٹنگ تبصرے کے لیے سامنے رکھ دی گئی ہو۔

''لگتا ہے جیسے ان سیلن زدہ دیواروں اور خشک پتوں کی خوشبو تک حسیات میں اتر آئی ہو۔ تخیل تمہاری پوروں سے یوں نکلتا ہے جیسے جادوگر کے رومال سے کبوتر۔ واہ سبحان اللہ.....''

پینٹنگ جیسی بھی ہوتی پاپا کا تبصرہ بہت شاندار ہوتا۔ تب میرا شدت سے جی چاہتا کہ پاپا میری پینٹنگز کی بھی ایسے ہی تعریف کریں اور ایسے ہی میری انگلیوں پہ بھی بوسہ دیں۔ میں پوری محنت سے پینٹنگ بنا کے ان کے سامنے لاتی تو وہ سرسری سا دیکھ کر حوصلہ افزائی کم اور تنقید کڑی، والے انداز میں بولتے:

''اپنا تخیل وسیع کرو اور اس کو رنگوں سے بات کرواؤ۔ ایک اچھی تصویر بنا جھول کھاتی مکمل کہانی جیسی ہوتی ہے۔ ربط نہ ٹوٹنے پائے، بس کہتی چلی جائے، حسیات میں اتر کے بولے، ابھی اور محنت کرو۔''

وہی سادہ مگر سخت جملے۔ میری آنکھیں نمکین پانیوں سے بھر گئیں اور وہ مجھے یوں دیکھنے لگے جیسے بہت دور کہیں خلاؤں میں دیکھتے ہوں، ہاں وہاں ایک خلا تھا، میں تو کہیں نہ تھی۔

اپنی عدم موجودگی نے مجھے دکھی کر دیا۔

''بی بانہ سے سیکھو نا'' اس آخری جملے نے پہلے مجھے دکھی کیا، پھر شکست خوردہ اور پھر میرے اندر غم و غصہ بھر دیا۔ میں کیوں نہیں ہوں؟

PDF Compressor Free Version

میں کہاں ہوں؟ ہر طرف بی بانہ..... میں نے دکھ سے پاپا کو دیکھا مگر وہ مزید رکے بنا واپس مڑ گئے تھے جب تک ان کے قدموں کی چاپ مدھم ہوئی، میں نے برش کسی ایک رنگ میں ڈبویا اور پوری پینٹنگ پہ پھیر دیا۔ وینگوف کی طرح اپنا کان کاٹ کے تصویر کو امر کرنے کا میرا کوئی ارادہ نہ تھا، سو میں نے سارا سامان ڈسٹ بن میں پھینک کے ہاتھ جھاڑ لیے۔

میں اور بی بانہ ایک تصویر کے دو رخ تھے بالکل الٹ، یکسر متضاد، میری چندھی مندھی سی آنکھوں کا بی بانہ کی سبزی مائل سنہری آنکھوں سے کیا موازنہ، کہاں میرے شولڈر کٹ مختصر سے بال اور کہاں لیئر کٹ والے بی بانہ کے ریشمی سیدھے لمبے گھنے بال۔ میرے زرد سخنے اور بی بانہ کی گلابی ایڑیاں اور ہاتھ میرے تو کیا پورے گھر میں کسی کے بھی اتنے حسین نہ تھے۔ مخروطی انگلیوں والے نازک اور نرم آرٹسٹک ہاتھ۔ کزن لوگ تو رشک کیا کرتے اور میں اپنے عام سے ہاتھوں کو چھپانے لگتی۔ میری زبان آدھی اردو آدھی انگریزی میں لپٹی غوطے کھاتی اور بی بانہ اردو بولتی تو لگتا، لکھنؤ یا دلی کا رنگ اس سے بہتر کہاں نظر آئے گا اور جب انگریزی بولتی تو فرنگیوں کو مات دے دیتی۔ فلسفہ، ادب، فیشن، ثقافت اور کرنٹ افیئرز پہ دلائل، تبصرے، تجزیے، جب کہ مجھے تو چند کورس کی چیزوں کے علاوہ کچھ علم تھا ہی نہیں تو بحث مباحثہ کیسا۔

اتنا منصفانہ موازنہ کرنے کے باوجود میں سمجھتی تھی کہ میری موجودگی کو "عدم موجودگی" میں بدلنے کا حق کسی کو نہیں، مگر یہ حق وصول کرنے کے لئے مجھے بہت دشواری رہی اور بالآخر ناکامی کے پے در پے حملوں نے مجھے بی بانہ کے سامنے لا کھڑا کیا اور یہ جنگ لڑتے لڑتے ایک وقت آیا جب مجھے بی بانہ کے خیال سے ہی وحشت ہونے لگی اور جب بھی گھر میں یا رشتے داروں یا دوستوں میں سے کوئی میری بجائے بی بانہ کا راگ الاپتا، مجھ پہ اپنی گمشدگی ایک ہیجان خیز کیفیت طاری کر دیتی۔ اصل قلق تو مجھے پاپا کا تھا۔ پاپا، جو میرے آئیڈیل تھے، جن کے دو میٹھے بولوں کے لیے میں وہ ہر کام کرتی جو انہیں پسند تھا۔ انہیں متوجہ کرنے اور ان کی محبت پانے کے لیے کتنے پاپڑ بیلتی، مگر جونہی وہ متوجہ ہونے لگتے، بی بانہ اچانک جانے کیسے چھم سے درمیان میں آ کھڑی ہوتیں۔ پاپا کی قربت کے لمحے ڈھونڈتے ڈھونڈتے میں تھک سی جاتی۔ میرے اور پاپا کے درمیان اس کی موجودگی مجھ پہ دیوانگی طاری کرنے لگتی۔

مجھے یوں لگنے لگا تھا جیسے میں وہ ننھا سا پودا ہوں جو ہوا اور روشنی ناکافی ہونے کی وجہ سے کسی گھنے درخت کے نیچے اپنی موت آپ مر رہا ہے اور مجھے یوں چپ چاپ مر جانا گوارہ نہیں تھا سو میں اردگرد کی زہریلی جڑی بوٹیوں سے اپنی نمو بچانے میں سرگرداں ہو گئی کہ بہر حال مجھے "عدم" ہونا کسی طور پر پسند نہ تھا۔ مجھے پتہ بھی نہ چلا کہ ان میں سے سب سے زہریلی بوٹی نفرت کی ہے۔ نفرت کی زہریلی بوٹی کے پتے میرے اندر کی گڑیا کو نیلا کرتے جا رہے تھے۔ اس سے پہلے کہ میں نیلو نیل ہوتی، میں نے فرار کا راستہ تلاشنا شروع کر دیا۔

اس شام میں علی کے ساتھ ایم ایم عالم روڈ پہ کافی شاپ میں کافی پی رہی تھی۔ میں فائنل سمسٹر سے اسی روز فارغ ہوئی تھی۔ علی دو روز پہلے ہمارے گھر آیا تھا اور سب گھر والوں نے یہ جان کر کہ وہ مجھے پرپوز کرنے والا ہے، اس کو بے حد پسند کیا اور خاص طور پہ پاپا اور بی بانہ اور میں جو پاپا سے کبھی دور نہ جانا چاہتی تھی۔ علی ہی اب ایسا بندہ تھا جو مجھے اس تکلیف سے نکال نہ بھی پاتا تو کم از کم دور ہی لے جاتا، اس لیے میرا اس کی طرف متوجہ ہونا اور یہاں اس سے ملنے آنا اسی راہ فرار اختیار کرنے کی پہلی کڑی تھی۔ میں اسے یوں دیکھ رہی تھی جیسے کوئی اپنے نجات دہندہ کو دیکھتا ہے۔

"تمہارے گھر والوں سے مل کے مجھے بہت اچھا لگا۔"

وہ مسکراتی نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔

"اور بی بانہ....."

علی نے کرسی کی پشت سے سر ٹکایا اور پھر ایک دم بولا:

"ارے یار تم بی بانہ جیسی کیوں نہیں ہو....."

اور مجھے لگا کسی نے کافی شاپ کی تمام گرم کافی میرے سر پہ انڈیل دی ہو۔ میرے جسم و جاں جھلسنے لگے۔ مجھے لگا میرا پورا جسم گرم پانیوں کی زد میں ہے اور چھالوں سے اَٹ گیا ہے۔ میں کیوں نہیں ہوں؟ میں کہاں ہوں؟ ہر طرف بی بانہ..... زہریلی بوٹیوں نے اپنا اثر دکھانا شروع کر دیا۔ میں نے گرم کافی کا مگ اٹھایا اور غصے سے اس کی طرف

PDF Compressor Free Version

اچھالا اور وہ بھی میری نیت بھانپتے ہوئے مگ کے گرم پانی سے بھی زیادہ تیزی سے اچھلا:

"ہے۔ جھٹ...... یہ کیا کررہی ہو تم۔ تم پاگل تو نہیں ہوگئیں......اف......ہاتھ جلادیا......سائیکو......"

یہ آخری لفظ تھے، جو میں نے سنے اور باہر نکل آئی۔ جب تیز تیز چلتے میں نے بددعا کی:

"یہ بی بانہ مر کیوں نہیں جاتی۔" گویا سانپ نے کینچلی بدلی اور پرانی کھال وہیں پھینک کے پھنکارتا ہوا یہ جا، وہ جا۔

ایک بار پھر مایوسیوں نے میرے اندر ڈیرے ڈال لیے اور میں اعلیٰ تعلیم کے لئے بیرون ملک جانے کو بضد ہوگئی۔ سب سمجھا بجھا کے تھک چکے تھے، مگر میں جلد سے جلد اس سرخ دیواروں والی عمارت سے غائب ہونا چاہتی تھی۔ سرخ دیواروں والی عمارت، جسے سب "گھر" کہہ رہے تھے۔ مجھے کہیں دور گم ہونا تھا، اپنا "ہونا" برقرار رکھنے کے لیے اور تب ان ہی راتوں میں سے ایک رات بی بانہ شدید بیمار ہوگئیں، سب کا رخ ہسپتال کی طرف تھا اور میں بے حسی کی بکل مارے سب کو آتا جاتا تکتی رہی۔

وہ تیسرا یا چوتھا روز تھا جب پاپا نے مجھے ہسپتال جانے کو کہا اور میں ذومبی بنی ان کے پیچھے ہولی۔ پرائیویٹ روم کے بیڈ پہ لیٹی کوئی اور نہیں بی بانہ تھیں۔ میں نے چور نگاہوں سے ان سبزی مائل سنہری کانچ جیسی آنکھوں کو دیکھا۔

"زوئی ڈارلنگ......" آواز تھی کہ گھنے جنگلوں میں گمشدہ تنہا غزال، میں نے نظر اٹھا کے نحیف و نزار وجود کو دیکھا آرتھرائٹسٹک تخروطی انگلیوں والا ہاتھ مجھے بلانے لگا۔ میں آہستہ سے چلتی بی بانہ کے قریب آئی اور کسی سنگی مجسمہ کی طرح کے اپنے بے حس ہاتھ کو اس کے ہاتھ پہ رکھ دیا۔ سبزی مائل سنہری آنکھیں لبالب بھر گئیں۔

"تو کیا واقعی بی بانہ مر جائے گی؟"

اس خیال کے آتے ہی میرے اندر سناٹا پھیلنے لگا۔ لمس کی حرارت بی بانہ کے ہاتھ سے میرے ہاتھ میں سے ہوتی مجھ میں منتقل ہونے لگی۔ یہ کیسی حرارت تھی جو کپکپی طاری کررہی تھی۔ ٹھنڈ میرے ہاتھوں سے شروع ہوئی اور پورے جسم میں پھیل کر زہریلی بوٹیوں کا زہر چوسنے لگی۔

اس قدر سرد ہاتھ کس کے تھے؟ میرے یا بی بانہ کے؟ مجھے پورے ہوش و حواس کے ساتھ اس کی ٹھنڈ محسوس ہورہی تھی، کسی مکمل کہانی جیسی، کسی پرفکٹ تصویر جیسی اور......اور مجھے یاد ہے، بہت اچھی طرح یاد ہے کہ ہم دونوں میں سے کسی ایک کے ہاتھ یخ ٹھنڈے ہوچکے تھے۔ کوئی ایک ہم میں سے مرگیا تھا۔ جانے کون؟ ہاں......! مگر کوئی ایک مرگیا تھا۔ میں یعنی زویا عرف زوئی ڈارلنگ مرچکی تھی یا مہربانو عرف بی بانہ......میری مما......میری سگی ماں......

قلم کار حضرات توجہ دیں

اپنی تخلیق کے ساتھ اپنا نام جو آپ کے بینک اکاؤنٹ میں ہے، انگریزی میں ضرور لکھیں، ساتھ ہی بینک کا نام و پتہ، اکاؤنٹ نمبر اور IFSC Code بھی تحریر کریں۔

اپنا موبائل نمبر اور مکمل پتہ بھی انگریزی میں تحریر کریں تاکہ آئندہ آپ کے معاوضے کی رقم سیدھے آپ کے اکاؤنٹ میں جمع کردی جائے اور آپ کو دشواری نہ ہو۔

اس اعلان کو خاص طور پر وہ سبھی قلم کار بھی نوٹ فرمالیں جن کا کسی بھی طرح کے لین دین کا تعلق بہار اردو اکادمی سے ہے۔

—— سکریٹری

زبان و ادب کی قیمت میں اضافہ

ماہ اکتوبر کے اس شمارے سے

"زبان و ادب" کی قیمت میں ہلکا سا اضافہ کیا جارہا ہے

☆ فی شمارہ: پندرہ روپے ☆ زرسالانہ: ایک سو پچاس روپے

ایجنٹ اور خریدار حضرات نوٹ فرمالیں۔ (سرکولیشن مینیجر)

PDF Compressor Free Version

نشاط پروین
C/o Eqbal Hasan Azad, Shah Colony
Shah Zubair Road, Munger 811201 (Mob. 8434471466)

سناٹا

انسان ابھی ہے، ابھی نہیں ہے۔ سوچ کر کچھ عجیب سا لگتا ہے۔ کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے۔

کیا بھروسہ ہے زندگانی کا
آدمی بلبلہ ہے پانی کا

مجھے ابھی تک یقین نہیں آرہا ہے کہ بڑی پھوپھی اب نہیں رہیں، جنہوں نے اپنے بال بچوں کی دنیا آباد کی، وہ خود اس دنیا سے منھ موڑ گئیں۔ انہیں تو ابھی حج کو جانا تھا، مگر وہ وہاں چلی گئیں جہاں سے کوئی لوٹ کر نہیں آتا۔

انسان اپنی زندگی میں کیا کیا پلان بناتا ہے، کیسے کیسے خواب دیکھتا ہے، مگر ہوتا وہی ہے جو منظور خدا ہے اور یہ شاید خدا ہی کی رضا تھی کہ میں نے ان کے انتقال سے بس تھوڑی ہی دیر پہلے انہیں دیکھا تھا۔ میرے نصیب میں شاید ان کا آخری دیدار لکھا تھا۔

میں اپنے شوہر کے ساتھ پوجا کی چھٹیوں میں وہاں گئی ہوئی تھی۔ مجھے دیکھ کر ہمیشہ کی طرح ان کے چہرے پر مسکراہٹ کھیل گئی۔ ان کے مسکراتے ہوئے چہرے کو دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ اندر سے اتنی بیمار ہیں۔ پچھلے مہینے بھی تو ان کی حالت اتنی بگڑ گئی تھی کہ ہاسپیٹل میں داخل کرنا پڑ گیا تھا۔ میرے دل میں انہیں دیکھنے کی شدید خواہش پیدا ہوئی تھی، مگر میں چاہ کر بھی انہیں دیکھنے نہیں جا سکی کیونکہ میرے ''اُن'' کے پاس چھٹیاں نہیں تھیں۔ بس دل مسوس کر رہ گئی، پھر خبر ملی کہ اب وہ پہلے سے بہتر ہیں اور گھر لوٹ آئی ہیں تو دل تو یک گونہ تسلی ہوئی۔

وہ بڑی سے بڑی مصیبت کو خاطر میں نہ لاتی تھیں۔ بڑی ہمت اور حوصلے والی خاتون تھیں۔ ان کی زندگی میں کئی حادثے ہوئے، کئی طوفان آئے، ان کے خرمن پر کئی بار بجلیاں گریں، مگر ان کے چہرے پر شکن تک نہ آئی۔ اگر کبھی کوئی افسوس ظاہر کرتا تو کہتیں کہ اس میں کون سی نئی بات ہے۔ دنیا تو غم اور خوشی دونوں کا نام ہے۔ دیکھو فلاں کے ساتھ ایسا ہوا، فلاں کے ساتھ ویسا ہوا، اگر میرے ساتھ بھی ہوا تو کیا ہوا۔ وہ کہا کرتی تھیں کہ انسان پریشانیوں کی گنتی کرنے میں تو ماہر ہے، مگر خدا کی نعمتوں کا حساب بھول جاتا ہے۔

میں جب بڑی پھوپھی کی زندگی پر نظر ڈالتی ہوں تو آنکھوں کے سامنے ایک ایسی عورت کی تصویر آجاتی ہے جو طوفان میں دیا جلائے کھڑی ہے۔ ابھی ان کی شادی کو چند ہی سال ہوئے تھے کہ ان کے شوہر یعنی میرے پھوپھا جان ایک حادثے میں جاں بحق ہو گئے۔ ان دنوں میں بہت چھوٹی تھی اور ساری باتوں کو ٹھیک طور سے سمجھ نہیں پاتی تھی۔ بہت سی باتیں کانوں میں پڑتی رہتی تھیں۔ ان میں کچھ سمجھ میں آتی تھیں اور کچھ نہیں۔

گاؤں میں ان کا سسرال ہمارے گھر کے پاس ہی تھا۔ بیوگی کے بعد وہ چند مہینوں تک گاؤں میں رہیں، پھر اپنے بچوں کو لے کر شہر شفٹ کر گئیں۔ شہر میں بھی ہم لوگوں کا ایک آبائی مکان تھا جس کے ایک حصے میں ان کا فلیٹ تھا اور دوسرے حصے میں ہم لوگوں کا۔ اب ان کی زندگی کا محور و مرکز ان کے بچے تھے۔ سبھوں کی تعلیم و تربیت اور شادی بیاہ کی ذمہ داری اب ان کے سر تھی اور انہوں نے یہ ذمہ داری نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ نبھائی۔ شوہر کی قلیل پنشن اور گاؤں سے آنے والی محدود آمدنی ہی ان کی زندگی کا سہارا تھی اور اتنی کم آمدنی میں بھی انہوں نے اپنے بال بچوں کی پرورش شاندار طریقے سے کی۔ اچھا کھانا، عمدہ لباس اور بہترین تعلیم۔

وقت گزرتا گیا اور ننھے ننھے پودے تناور درخت میں تبدیل

PDF Compressor Free Version

ہوتے گئے۔ بیٹے پڑھ لکھ کر برسرروزگار ہو گئے اور غیر ممالک میں جا بسے۔ روپے پیسے کی ریل پیل ہونے لگی، لیکن بڑی پھوپھی جیسی تھیں ویسی ہی رہیں۔ پیسہ آ جانے سے ان کے رہن سہن اور طور طریقوں میں کوئی فرق نہیں آیا۔ وہ پہلے بھی صابر و شاکر تھیں اور ابھی بھی وہ ہر حال میں خدا کا شکر بجا لایا کرتی تھیں، لیکن انسان کا مصیبت اور پریشانی سے تو چولی دامن کا ساتھ ہے۔

بڑی بیٹی کی شادی انہوں نے بڑی دھوم دھام سے کی اور دل کے سارے ارمان نکالے۔ شادی کے ایک سال بعد جب انہوں نے نواسی کا منھ دیکھا تو خوشی سے پھولی نہ سمائیں۔ کیسی نرم و نازک سی، پیاری پیاری گڑیا تھی ان کی نواسی۔ خوب گورا رنگ، بڑی بڑی خوبصورت آنکھیں، ستواں ناک اور گلابی ہونٹ۔ نواسی کی آمد نے گویا ان کے جسم میں نئی روح پھونک دی تھی اور وہ اسے ہر وقت گود میں اٹھائے پھرتیں، لیکن ابھی جی بھر کے خوش بھی نہ ہو پائی تھیں کہ تقدیر کا بے رحم طمانچہ اس خاندان کے منھ پر پڑا۔ ان کے داماد ایک حادثے میں ہلاک ہو گئے۔ بیٹی بیوہ اور نواسی یتیم ہو گئی۔ ان کے چہرے پر غم کی لکیریں نمایاں ہو گئیں، لیکن جلد ہی انہوں نے خود پر قابو پا لیا۔ بیٹی کی پہاڑ جیسی زندگی سامنے کھڑی تھی۔ انہوں نے ہمت نہ ہاری اور بیٹی کا گھر ایک بار پھر بسا دیا۔

یادیں بہت ساری ہیں۔ کچھ روشن کچھ دھندلی، کچھ کھٹی کچھ میٹھی۔ انہیں قصے سنانے کا بڑا شوق تھا۔ اپنے گاؤں کے واقعات، خاندان بھر کی کہانیاں، عورتوں اور مردوں کے ناجائز تعلقات کے قصے۔ وہ یہ سب باتیں مزے لے لے کر بیان کرتیں۔ انہیں اس وقت اس بات کا خیال نہ رہتا کہ آس پاس چھوٹے چھوٹے بچے اور بچیاں بھی ہیں جو اُن کی باتوں کو غور سے سن رہے ہیں اور انہیں خیال بھی کیسے آتا کیونکہ ماضی کے جھروکوں میں جھانکتے وقت ان کی نگاہیں دور کہیں خلاؤں میں بھٹکتی رہتیں۔ وہ سناتی جاتیں اور ہم لوگ سنتے جاتے۔ افسوس کہ ماضی کی داستانیں سنانے والی آواز سدا سدا کے لیے خاموش ہو چکی ہے اور دل کے اندر سناٹا پھیلتا جا رہا ہے، لیکن باہر والوں کو کسی کے دل میں پھیلتے ہوئے سناٹے سے کیا مطلب؟

شہر بھر میں دسہرہ کی دھوم تھی۔ سڑکوں پر لوگوں کا اژدہام تھا۔ ہم لوگ بھی شام سے اس بھیڑ کا حصہ بنے گھوم رہے تھے، پھر ہم لوگ جب چلتے چلتے تھک گئے، تب گھر جانے کے لیے مڑے۔ گلی میں داخل ہونے کے بعد پہلے بڑی پھوپھی کا گھر ملتا تھا۔ ہم لوگ ان کے گھر بغیر دروازہ کھٹکھٹائے داخل ہو گئے۔ دروازہ تو غیروں کا کھٹ کھٹایا جاتا ہے، اپنوں کا نہیں۔

وہ تو ڈرائنگ روم میں بیٹھ گئے اور میں اندر والے کمرے میں پھوپھی جان کے پاس چلی گئی۔ وہ بستر پر لیٹی تھیں۔ معلوم ہوا کہ آج طبیعت کچھ زیادہ ہی خراب ہے، لیکن اس حال میں بھی وہ برابر بولے جا رہی تھیں۔ میں نے دیکھا کہ ان کا سینہ زور زور سے چل رہا ہے اور انہیں سانس لینے میں دشواری ہو رہی ہے، مگر وہ اپنی تکلیف کو چہرے سے ظاہر ہونے نہیں دے رہی تھیں۔ ان کی نواسی فاطمہ ان کا بلڈ پریشر چیک کر رہی تھی۔ اس کے چہرے کو دیکھ کر لگا کہ پھوپھی جان کا بلڈ پریشر کافی بڑھا ہوا ہے، مگر وہ تو مسلسل دھیرے دھیرے بولے جا رہی تھیں، پھر انہوں نے فاطمہ سے کہا کہ وہ خالو جان کو ناشتہ کرائے۔ ان کا اشارہ میرے شوہر کی جانب تھا۔

اس وقت گھر میں ان کی بڑی بیٹی اور بہوئیں بھی موجود تھیں۔ میں نے ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ محبت کی گرمی ان کی ہتھیلی سے پھوٹ رہی تھی۔ رات کے نو بج گئے تو ہم لوگ اپنے فلیٹ پر چلے گئے۔ ابھی تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ فاطمہ کا فون آ گیا۔ اس نے بتایا کہ بڑی پھوپھی کی طبیعت کچھ زیادہ ہی خراب ہو گئی ہے اور انہیں ہاسپیٹل لے جایا جا رہا ہے۔ میں نے دل ہی دل میں ان کے لیے دعا مانگی اور پھر کچن میں مصروف ہو گئی۔ ابھی ایک گھنٹہ بھی نہ گزرا تھا کہ کسی کا فون آیا:

''بڑی پھوپھی گزر گئیں۔''

میرے منھ سے چیخ نکل گئی اور میں گرتے پڑتے پھوپھی کے فلیٹ کی جانب دوڑ پڑی۔ یہ کیسے ہو گیا؟ ابھی تھیں ابھی نہیں ہیں۔ کیا ان کی زبان ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گئی؟ کیا ان کی آنکھیں سدا کے لیے بند ہو گئیں۔ دل ماننے کو تیار نہ تھا، مگر حقیقت حقیقت ہے۔

ان کے فلیٹ پر کہرام مچا ہوا تھا۔ لوگ پریشان تھے۔ یہ اچانک کیا ہو گیا؟ کیسے ہو گیا؟ ہر شخص فون لگانے کی کوشش کر رہا تھا۔

PDF Compressor Free Version

آس پاس کے لوگ اور رشتہ دار سب جمع ہونے لگے۔ مرد ہاسپیٹل کی طرف دوڑ پڑے اور ادھر میت کا انتظار ہونے لگا۔ فاطمہ ان کے ساتھ رکشے پر سوار ہو کر گئی تھی۔

مرد لوگ موٹر سائیکل پر تھے۔ ہاسپیٹل میں ان کے ٹیسٹ لیے گئے تھے۔ بی پی اور بلڈ شوگر دونوں بڑھے ہوئے تھے، لیکن ڈاکٹر نے کہا تھا کہ خطرے کی کوئی بات نہیں ہے، پھر انہیں ایک انجکشن لگایا گیا اور انہیں گھر واپس لے جانے کو کہا گیا۔

فاطمہ نے انہیں سنبھال رکھا تھا۔ ان کی طبیعت کچھ سنبھلی اور وہ پھر فاطمہ سے باتیں کرنے لگیں۔ شہر کی جگمگ روشنیاں انہیں بہت اچھی لگ رہی تھیں، لیکن اچانک باتیں کرتے کرتے ان کی گردن ڈھلک گئی۔ فاطمہ کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ اس نے رکشے والے کو رکنے کو کہا۔ رکشے کے پیچھے پیچھے گھر کے جو لوگ موٹر سائیکل پر دھیرے دھیرے آ رہے تھے وہ بھی رک گئے۔ رکشے کو واپس اسپتال کی جانب موڑ دیا گیا۔ وہاں ڈاکٹروں نے انہیں مردہ قرار دے دیا اور ان کے چہرے کو چادر سے ڈھک دیا گیا، پھر یہ اندوہناک خبر پورے میں بجلی طرح پھیل گئی۔ ان کا فلیٹ آدمیوں سے بھر گیا۔ گلی بھی بھر گئی اور ہر شخص کی نگاہیں سڑک پر ٹک گئیں۔

اسپتال میں خانہ پری ہوئی اور ان کا تابوت رات کے ایک بجے گھر پہنچا۔ آہ و بکا کی صدا بلند ہوئی اور پوری فضا پر غم و اندوہ کے بادل چھا گئے۔ گھر کے لوگ تو میت کے ساتھ ساتھ فلیٹ کے اندر داخل ہو گئے۔ ہر طرف چیخ پکار کی آواز بلند ہو رہی تھی، مگر میرے سامنے سناٹا تھا، صرف سناٹا۔ ❁❁

سایہ فگن دھوپ (ص ۵۰ سے آگے)

کئی دنوں بعد خورشید صاحب کے کسی جانکار کا فون آیا کہ گھر والوں کی جان سے مار دینے کی دھمکی کے باعث وہ کہیں روپوش ہو گئے تھے۔ حالات سدھرنے کے بعد وہ پھر کوئی تاریخ طے کر کے رخصتی کرا کے لے جائیں گے۔ صبا کے بھائیوں نے جو جوانی کی دہلیز پر قدم رکھ چکے تھے، فون پر صاف لفظوں میں منع کر دیا تھا۔ بیگم صاحبہ بھی غصے کی زیادتی سے کانپ رہی تھیں۔

صبا ایک بار پھر خیالات کے عجیب چوراہے پر کھڑی تھی۔

خورشید صاحب کی غیر ذمہ دارانہ اور بزدلانہ حرکت پر اسے بہت غصہ تھا، لیکن دل میں خورشید صاحب کی محبت کی روشنی ابھی باقی تھی۔ اسے کبھی اپنے بھائیوں کا فیصلہ درست لگتا تو کبھی خورشید صاحب کی مجبوری ہاتھ جوڑے کھڑی ہو جاتی۔ دل کی آواز مختلف تھی اور حالات کا تقاضا مختلف۔ پورے گھر کی عزت کا سوال تھا۔ چھوٹے بھائی بہنوں کے لیے مستقبل کا راستہ طے کرنے کی بات تھی۔

ایک دن صبح صبح صبا کی کسی سہیلی کا فون آیا۔ اس کے بھائی نے فون اس کے حوالے کر دیا۔ اس نے جیسے ہی فون پر بات شروع کی تو اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ دوسری طرف خورشید صاحب تھے، جو اپنی حرکت پر نادم ہو رہے تھے اور منانے کی کوشش بھی کر رہے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ اب وہ رخصتی کرا کے باہر ملک چلے جائیں گے اور پھر دونوں آرام سے رہیں گے۔ صبا کا رواں رواں کان بن گیا تھا۔ اس کے کانوں میں خورشید صاحب کی التجائیں تھیں۔ نظروں میں بھائی بہنوں کے چہرے تھے اور دماغ میں ماں کی حالت زار تھی۔ وہ کئی خانوں میں منقسم ہو چکی تھی۔

اچانک اس نے زور سے ریسیور کریڈل پر پٹخ دیا۔ ٹیلیفون کے پاس رکھا گلاس ایک چھناکے سے زمین پر آ رہا اور اس کی کرچیاں فرش پر ادھر ادھر بکھر گئیں۔ ادھر کمرے کی کھلی کھڑکی سے دھوپ اندر داخل ہو کر اس پر سایہ فگن ہو گئی تھی۔ ❁❁

ضروری اطلاع

زبان و ادب کی خریداری کے لئے آپ زرسالانہ سو روپے براہ راست اردو اکادمی کے اکاؤنٹ میں بھی ڈال سکتے ہیں، لیکن رقم بھیجنے کی جانکاری کے ساتھ ہی اپنا مکمل پتہ اور موبائل نمبر اکادمی کو ضرور بھیج دیں۔

Bihar Urdu Academy

Bank of India, Chauhatta, Patna 800004

SB A/c No. 440810100006014

IFSC Code- BKID0004408

PDF Compressor Free Version

منظومات

خورشید حیات

6/275, Lalita Park, Laxmi Nagar, Delhi 110092 (Mob. 9868706845)

مٹی بدن نظمیں

تم میرا خمار ہو یا سرور

تحریر بدن چہرہ میں
یہ رنگ سنہرا کس کا ہے
دل کی ہر دھڑکن سے
آواز یہ کس کی آتی ہے؟

دیسی ہے یہ جستجو
کس کی ہے یہ گفتگو
دھوپ دھوپ
شجر شجر
چھاؤں چھاؤں
پاؤں پاؤں
ہر بشر کی ہے خبر
خود سے ہوں میں بے خبر
تو پیار کر تو پیار کر
جہان عشق آباد کر

آنگن میں
تم ابھی
اتر آئے ہو شاید
ہر طرف
روشن روشن
مہماں باتیں

تم
عشق کا
اک جنوں
جیسے سورج، چاند
تم
میری قبا
جو تار تار
مگر
روشن روشن
تم
میرا
خمار ہو یا سرور؟

❁❁❁

زندگی ریت گھروندا

وہ سنہری سی تھی
سنہری آج بھی ہے
وہ تپتی تھی، تپتی آج بھی ہے
سمندر کی اک پیاس لیے
بھٹکتی تھی، بھٹکتی آج بھی ہے
کبھی نرم ہتھیلیوں سے چپک جاتی تھی
چپکتی آج بھی ہے
کبھی وقت کی طرح پھسل جاتی تھی
پھسلتی آج بھی ہے
آج ان پھسلتے ہوئے لمحوں میں
تمہاری یاد بہت ستائی
یاد آئی ریت گھروندوں کی
ان دروازوں کی
جو دائرے کی شکل لئے ہوتے تھے
ان دائروں کی کوئی دشائیں نہیں تھیں
اک آج کا دن ہے

PDF Compressor Free Version

ہر چہرہ اپنی اپنی دشا لئے پھرتا ہے
تھرکتا ہے
اور بہت پیچھے کی طرف
چھوٹتی زندگی ریت گھروندوں سے
دو معصوم ہتھیلیاں
آواز دیتی ہیں
جب جب دائروں کو توڑو گے
نئی نئی دشائیں تمہیں صدائیں دیں گی
تب تم مجھ سے ملنے آجانا
او جاناں ریت گھروندے میں معصوم ہتھیلیاں
آج بھی تمہارے اسپرش کے انتظار میں ہیں

پورب، پچھم
اتر اور دکھن کی طرف
کھلنے والی تمام کھڑکیوں سے
بس ایک ہی منظر!
بنجر اور سنگلاخ سرزمین
بانجھ دھرتی
تلابوں میں بنتے مٹتے دائرے
تڑپتی اچھلتی مچھلیاں
اور
ان سب کے بیچ
کراہتی ہوئی بوڑھی تاریخ

جنم دے رہی تھی
ایک نئے سورج کو
جس کی کرنوں سے
ادھوری چٹان پر اگا ہوا پھول
کھلا کھلا کر گر رہا تھا
نئی تاریخ بن رہی تھی
سورج کا چہرہ بگڑتا جا رہا تھا

نگاہوں میں
پتے ہوئے
بھیگے ہوئے
بدن شور کرتے ہیں
کبھی سہمی ہوئی
سوکھی ہوئی
ٹہنیاں چیختی ہیں
سکڑتی ہوئی
ندیوں کی چھاتیاں
چیختی ہیں
چلو یہاں سے دور کہیں
چلتے ہیں
یہ شہر اب مناسب نہیں
''جڑوں کے لئے

❁❁❁

PDF Compressor Free Version

نوشاد مومن

Editor "Mizgaan", 21-B, Alimuddin Street

2nd Floor, Kolkata 700016 (Mob. 9830126311)

تعبیر خواب کی

سنا ہم نے کہ موسم کے بدلنے سے
ہوائیں بھی بدلتی ہیں
گھروں کی رونقیں تبدیل ہوتی ہیں
مزاجوں کو نیا احساس ملتا ہے
سنا ہم نے کہ موسم کے بدلنے سے
نیا سورج نکلتا ہے
اُمیدوں کی کرن بھی جگمگاتی ہے
حقیقت اور گماں کے فاصلے بھی ساتھ مٹتے ہیں
سنا ہم نے کہ موسم کے بدلنے سے
نئے پیکر ابھرتے ہیں
نئے کچھ خواب سجتے ہیں
نئے ارمان پلتے ہیں
سنا ہم نے کہ موسم کے بدلنے سے

نئے کچھ پھول کھلتے ہیں
نئے کچھ دیپ جلتے ہیں
نئے کچھ باب کھلتے ہیں
مگر یہ کیا کہ سورج جو نیا ابھرا
وہ سورج ہے نیا، پھر بھی
نئی کرنیں گھر آنگن میں
تو یکساں نہیں اتریں
یہاں تیور تو اس کے سب
وہی ہیں جو پرانے تھے
ہماری بند آنکھوں کو
نہ کوئی خواب ہی بخشا
نہ ان کی آج تک تعبیر ہی نکلی.....!

❋❋❋

PDF Compressor Free Version

ارمان نجمی

Peeli Kothi, Moh. Baqarganj, Patna 800004

غزلیں

رگ و پے میں اذیت کی گھٹن محسوس کرتا ہوں
بہت بدلا ہوا رنگ چمن محسوس کرتا ہوں
ہوائے ناشناسی کا چلن محسوس کرتا ہوں
بھری بستی کو اب دار محن محسوس کرتا ہوں
مجھے پہچان کر جیسے نہیں پہچانتا کوئی
شناساؤں میں بھی بیگانہ پن محسوس کرتا ہوں
کوئی خو بو کسی میں بھی نہیں اگلے زمانے کی
رویے میں سبھی کے اک چبھن محسوس کرتا ہوں
سبھی کچھ ہے اگر اپنی جگہ پر پھر تو کیوں آخر
وطن میں رہ کے خود کو بے وطن محسوس کرتا ہوں
پڑا ہے حوصلوں پر جانے کس آسیب کا سایہ
قدم آگے نہیں بڑھتے ، تھکن محسوس کرتا ہوں
مری آمد پہ محفل میں سبھی ناراض ہیں جیسے
رفیقوں کی جبینوں پر شکن محسوس کرتا ہوں
اسی تحریر سے مل جائے گی کچھ خیریت میری
زیادہ کیا لکھوں ، کیا جان من محسوس کرتا ہوں
ولی کی قبر کیا ، درگاہ پر بھی بن گیا رستہ
مگر اب تک اسے سایہ فگن محسوس کرتا ہوں

❁❁❁

یاد آتا ہے بھولتا ہوا کچھ
طاق وعدہ پہ تھا رکھا ہوا کچھ
گونجتا رہتا ہے سماعت میں
ورق سادہ پہ لکھا ہوا کچھ
سر اٹھا کر زمیں کو دیکھتا ہے
خاک کی گود میں گرا ہوا کچھ
اپنی حد سے نکلنا چاہتا ہے
راکھ کے ڈھیر میں دبا ہوا کچھ
سن لیا اس نے جو کہا نہ گیا
خامشی میں تھا بولتا ہوا کچھ
زہر کیسا رگوں میں دوڑتا ہے
اس کے لہجے میں تھا بھرا ہوا کچھ
وہ بھی آخر اسی کی نذر ہوا
کاسہ دل میں تھا بچا ہوا کچھ
ضبط کی کوئی حد نہیں ہوتی
نوک مژگاں پہ تھا رکا ہوا کچھ
مدعا کے قریب لے آیا
حرف انکار میں چھپا ہوا کچھ

❁❁❁

PDF Compressor Free Version

پروفیسر شاداب رضی

Deptt. of Urdu, T.M. Bhagalpur University, Bhagalpur 812007 (Mob. 9431875126)

غزلیں

دنیا ہوئی سہانی لکھ
بے بنیاد کہانی لکھ
وقت کہاں کب ٹھہرا ہے
وقت کو بہتا پانی ، لکھ
کر فانوس ہتھیلی کو
راتوں کو تابانی لکھ
''اس آباد خرابے میں''
کس نے خاک نہ چھانی لکھ
رنگ ہمارے حصے کا
یرقانی کیوں ، دھانی لکھ
کاغذ کے کچھ پھول کھلا
تتلی کو حیرانی لکھ
دانت کٹی جو کھاتے تھے
کیوں ہوئے دشمن جانی لکھ
شام کے سائے کو شاداب
صبح کی نقل مکانی لکھ

❁❁❁

گنبد میں ڈوبتی ہوئی آواز کی طرح
کوئی نہ رائیگاں گیا ہوگا مری طرح
لہجہ بدل بھی دیتا ہے مفہوم لفظ کا
لازم ہے کچھ بھی کہئے تو کہئے بھلی طرح
پرچھائیوں سے کھیلتے ، آئینہ دیکھتے
دن زندگی کے بیت رہے ہیں اسی طرح
دنیا کھنگال آئے مگر آپ ، آپ ہیں
شہکار حسن اور کہاں آپ کی طرح
ہر سانس اک ہجوم تمنا ، یہ گرد و پیش
سب ہم خیال کیوں نہیں ہوتے کسی طرح
تاراج منظروں سے بسے شہر بے شمار
آباد کاریوں کی یہی ہے نئی طرح
دہشت زدہ گھروں کے دریچے ہیں اداس
دروازے وسوسوں میں گھرے ہیں بری طرح
اہل طلب کی بھیڑ تھی ، میں بھی تھا ذوالجلال
میری طلب کو کیسے کہوں کس نے دی طرح

❁❁❁

PDF Compressor Free Version

جمال اُویسی

Deptt. of Urdu, M.R.M. College, Darbhanga 846004 (Mob. 7352284181)

غزلیں

حسن ضمیر سے مرے روشن لبادہ ہے
نیرنگیٔ جہاں میں مرا رنگ سادہ ہے
بھرتا ہوں میں زقند خلائے بسیط میں
اس کے علاوہ میری نہ منزل ، نہ جادہ ہے
فرصت کے وقت نوحہ جاں پڑھتا رہتا ہوں
وحشت سخن دریدہ ، بدن بے لبادہ ہے
اس بار تیری یاد ہمک ساتھ لائی ہے
اس بار موج خوں میں روانی زیادہ ہے
قطرہ میں میں نے دیکھ لئے دجلہ و فرات
ورنہ مری نگاہوں کی جنت کشادہ ہے

❁❁❁

شام تک ہوتا ہے میرا ہر نظارہ دودِ چشم
اس طرح ہوتا ہے مجھ پر آشکارا دودِ چشم
ڈھونڈتی ہیں جانے کیا نظریں فلک پر دیر تک
کہکشائیں گرد ہستی ہر ستارہ دودِ چشم
اٹھ کے محفل سے کدھر جاتی ہے اک دُھندلی لکیر
ڈولتا ہے دور تک کیونکر ہمارا دودِ چشم
تھی نگہہ اپنی حقیقت بیں ، مگر تھا انتظار
جس کے آنے تک ہوا مجھ کو گوارا دودِ چشم
قطرہ میں دجلہ نہ دیکھے تو اُویسی کیا کرے!
دل بہل جاتا ہے ورنہ ہر نظارہ دودِ چشم

❁❁❁

اک لمبی چپ ہے، چپ کے بعد سمندر ہے
رقص کیا کرتا ہے ایک شرارہ جیسا
پڑھتے پڑھتے اونگھنے لگ جاتی ہیں آنکھیں
میں بھی تمنائی بن کر آیا تھا جگ میں
میں نے اک تصویر بنانے کی کوشش کی
کسے جلانے کھڑے ہوئے ہو جمالؔ اُویسی

کس کو ڈھونڈنے تم آئے ہو، گھر بے گھر ہے
بے محور سی دنیا ہی اُس کا محور ہے
اُپدیشوں سے بھرا رسالہ خواب آور ہے
اب میری آشاؤں پر بھاری پتھر ہے
قرطاسِ ابیض پر کہرے کی چادر ہے
تم خاشاک سمجھتے ہو وہ لٹریچر ہے

❁❁❁

PDF Compressor Free Version

عمران راقم

3, Grant Street, Kolkata 700013 (W.B.)

غزلیں

ہم کیسی تقدیر بناتے رہتے ہیں
پانی پر تصویر بناتے رہتے ہیں

بھیج رہے ہیں جن خط کو ہم یاروں کے نام
ان پر ہم تطہیر بناتے رہتے ہیں

دست و پا کا ان کو مرے اندازہ کیا
خود اپنی زنجیر بناتے رہتے ہیں

سودا کرکے شیش محل کے خوابوں کا
نیند میں ہم جاگیر بناتے رہتے ہیں

باتوں سے وہ کاٹتے رہتے ہیں مجھ کو
نظروں کو شمشیر بناتے رہتے ہیں

ہم دونوں ہی آذر ٹھہرے جذبوں کے
وہ رانجھا ، ہم ہیر بناتے رہتے ہیں

دہشت ، دنگا ، ذات مذاہب کی تفریق
روزانہ کشمیر بناتے رہتے ہیں

صاف نہیں ہے جن کا دل وہ اوروں کی
داڑھی میں شہتیر بناتے رہتے ہیں

ان کا کاروبار غموں کی ہے تقسیم
ہم ہیں جو اکسیر بناتے رہتے ہیں

جن کا قول و فعل بھی راقم ہے مشکوک
ہم ایسے کو پیر بناتے رہتے ہیں

❁❁❁

بلا کی بھیڑ میں تنہا رہوں میں
سروں کے بیچ میں اونچا رہوں میں

بھرم میرا بچائے رکھ خدایا
برے ماحول میں اچھا رہوں میں

اجل کی گود میں سونے لگوں تو
ابد تک جانب قبلہ رہوں میں

ہمارے دل میں ہو سب کی عقیدت
نظر میں خود ، مگر نیچا رہوں میں

امیر شہر کو ٹھوکر میں رکھوں
فقیر شہر کے جیسا رہوں میں

یزیدوں سے کبھی بیعت نہ ہوگی
بلا سے عمر بھر پیاسا رہوں میں

ہماری عمر اب جو بھی ہو راقم
سبھی کے گود کا بچہ رہوں میں

❁❁❁

PDF Compressor Free Version

ابونصر فاروق صارمؔ

کھجور بنہ، پتھر کی مسجد، پٹنہ 800006 (Mob. 9973211318)

غزلیں

اجڑ نہ جائے کہیں چمن میں ہے شاخ نازک پہ آشیانہ
چمکتی بجلی ، بپھرتی آندھی کو چاہیے صرف اک بہانہ

ہمارے گھر کا یہ مسئلہ تھا، ہم اس کو حل اپنے گھر میں کرتے
مگر رقیبوں کی سازشوں نے بنا دیا اس کو اک فسانہ

ہماری الجھن ، ہماری مشکل ، ہماری بے چینی ، بے بسی کو
کرے گا حل کیا، سمجھ نہ پائے گا خود پرستوں کا یہ زمانہ

ستم کو سہیے ، تڑپتے رہیے ، مگر نہ فریاد لب پہ آئے
نہیں ہے ممکن کوئی بھی چھیڑے چمن میں اب درد کا ترانہ

چبھونا نشتر ، لگانا زخم اور شعار جن کا ہے بد کلامی
وہ کیا مداوائے درد کرتے ، نگاہیں پھیریں ، ہوئے روانہ

اصول اور ضابطے کی باتیں ، صداقتوں کی کہانیاں سب
سمیٹ کر اپنے پاس رکھئے ، روش ہوئی اب یہ احمقانہ

وفا ، خلوص اور خیر خواہی کی قدر دنیا میں اب نہیں ہے
اٹھائیں صارمؔ دکان اپنی ، کہیں گے سب آپ کو دوانہ

❁❁❁

مرے نارسا یہ نالے ترے بام تک نہ پہنچے
نہ ملی انہیں زباں اور یہ کلام تک نہ پہنچے

بڑی مشکلوں سے اے دل شب غم بسر ہوئی تھی
یہ سحر بھی رفتہ رفتہ کہیں شام تک نہ پہنچے

نئی راہ کی تمنا میں بھٹکنے والے راہی
ہوئے گمشدہ کچھ ایسے سر عام تک نہ پہنچے

کبھی آشنا تھے ہم تم ، بڑی دوستی تھی ہم میں
مگر اب تو ہے یہ صورت کہ سلام تک نہ پہنچے

ترے شہر میں ہیں ہر سو کسی بے وفا کے چرچے
مجھے خوف ہے ، یہ تہمت مرے نام تک نہ پہنچے

کبھی پوچھ کر تو دیکھو مری تشنگی کا عالم
یہ وہ ہاتھ ہیں جو اب کسی جام تک نہ پہنچے

وہ بھلا چکے ہیں تجھ کو یہی اک سبب ہے صارمؔ
کہ سلام تک نہ آئے جو پیام تک نہ پہنچے

❁❁❁

PDF Compressor Free Version

کتابوں کی دنیا

نام کتاب :	گرداب (ناول)
مصنف وناشر:	شموئل احمد
اشاعت :	۲۰۱۶ء (ایجوکیشنل پبلی شنگ ہاؤس، دہلی)
صفحات :	۱۸۶ قیمت : ۳۲۰ روپے
مبصر :	قنبر علی

شموئل احمد کا ناول ''گرداب'' ایجوکیشنل پبلشنگ ھاؤس ،دہلی نے ابھی ابھی سال ۲۰۱۶ء میں شائع کیا ہے۔ دلچسپ بات یہ بھی ہے کہ اس کی کمپوزنگ خود مصنف نے کی ہے۔

شموئل احمد کو ان کی تخلیقات کی بنا پر اردو قارئین جانتے ہیں ان کے افسانوی مجموعے پھر ناول ''ندی'' اس کے بعد ''مہاماری'' سے قارئین روبرو ہو چکے ہیں۔ اب کے معاملہ ''گرداب'' میں پھنس گیا ہے۔ اس ناول میں گرداب کو بنتے، مضبوط ہوتے اور ختم ہو جاتے ہوئے آپ دیکھ سکتے ہیں۔ یہاں بھی عورت ہے، جنس ہے اور اس کے لوازمات ہیں۔

شموئل احمد نے اس ناول میں غزل کا انداز اپنایا ہے، جس طرح غزل کے بنیادی تین کردار ہوتے ہیں، عاشق، معشوقہ اور رقیب، اسی طرح ان کے یہاں عاشق کے طور پر متکلم ہے، جو کسی شعبہ میں بڑے عہدے پر ہے۔ معشوقہ ساجی کے روپ میں ہے جو پانچ بچیوں کی ماں ہے۔ رقیب کبھی ساجی کا پتی، دُرجات ہے کبھی کہانی کا راوی اور مرکزی کردار ''میں'' کی بیوی نصیب ہے۔ نصیب کا آدھا نصیب اچھا ہے کہ بال بچے ہیں، پٹنہ میں ہیں، بچے پڑھ رہے ہیں۔ شوہر بڑے عہدے پر ہے، آدھا خراب ہے کہ اس کا شوہر دوسری عورت سے تعلق بنانے میں منہمک ہے۔ اِدھر وہ ایک شریف آدمی اور ایک اچھے بھلے شوہر کا روپ دھارے ہوا ہے۔ اُدھر وہ ایک ذمہ دار مخلص عاشق اور معشوقہ کے شوہر کے لئے بڑا اسٹیٹس سمبل اور تعلیم یافتہ مہذب پڑوسی بنا ہوا ہے۔

ہر چند کہ دُرجات ایک طرح سے بازار حسن کا وہ کردار نظر آتا ہے، جس کو تیسرا درجہ ملتا ہے۔ اب چونکہ بازار حسن کا چلن ختم ہو گیا۔ صارفی کلچر میں طوائفیں گھروں میں بکھر گئی ہیں۔ کسی بازار میں ان کے لئے اب جگہ نہیں ہے۔

شموئل احمد کی کہانیاں منٹو کے نہج پر جنسی ہم آہنگی کی تلاش میں بازار حسن کی بجائے گھر ہی میں شروع ہوتیں اور ختم ہو جاتی ہیں۔ منٹو گھروں میں داخل ہو کر جنسی رویے کو کہاں لکھ سکتا۔ اس وقت گھروں کا تقدس برقرار تھا اور بازار حسن کھل کھیلنے کی جگہ تھی۔ تمدن کے فروغ کے زیر اثر شہر کے بچے گلیوں میں کرکٹ کھیلتے ہیں، بڑے میدانوں کا گزر نہیں ہے، ہے بھی تو ایک انار دس ہزار بیمار کا معاملہ ہے، لہٰذا بچے گلیوں میں کرکٹ کھیلتے ہیں، تب گھروں کے شیشے ٹوٹتے ہیں۔

طوائفوں یا دوسری عورت سے جنسی ہم آہنگی کے لئے اب کوئی جگہ نہیں ہے، لہٰذا شموئل احمد ٹیلی پیتھی سے اس گھر کا پتہ چلا لیتے ہیں، جہاں ایک عورت خود فاحشہ کے طور پر ان کا انتظار کر رہی ہوتی ہے۔ یہاں ''گرداب'' کی موجوں میں لطف تو ہے، مگر اس کا کینوس چھوٹا ہے۔ یہاں جوار بھاٹا نہیں، اس لئے منظر اور پس منظر بھی پھیلتا نہیں ہے۔ یہ تو فن کار کا حسن اظہار ہے کہ قارئین اکتائیں گے نہیں۔ لطف ملتا ہے، ملے گا۔

دیکھنا یہ ہے کہ شموئل احمد کے ناول ''گرداب'' کا ''میں'' دومیان میں کس طرح رہتا ہے۔ اس کو یہ احساس ہونے لگتا ہے کہ ساجی سے کنارے ہو جاتا، مگر دل کے ہاتھوں مجبور رہا۔ کبھی دماغ کے اشارے سے بندھا رہتا ہے۔ کرے تو کیا کرے، پھر آخری حربہ یہ کہ وہ انتظار پالنے لگا کہ کوئی نہ کوئی صورت نکل آئے۔ ٹیرو کارڈ دیکھتا ہے تو ساجی کا گرداب خود غرق آب ہوتا نظر آیا۔

PDF Compressor Free Version

آخر یہ ہوا کہ وہ اپنے اہل خانہ اور ساجی کے گھر والوں کے ساتھ تھا اور ایک حادثے میں ساجی غرق آب ہو گئی۔ خس کم جہاں پاک، مگر اب ادھر ''میں'' کی شریک حیات پر یہ راز کسی ٹیلی پیتھی سے منکشف ہونے لگتا ہے کہ ساجی اس کے شوہر سے محبت کرتی تھی۔ ''میں'' کا کرب یہاں یہ ہے کہ وہ اس کا اعتراف نہیں کر سکتا۔ بچی کھچی زندگی میں اب کوئی زلزلہ نہ آجائے، اس لئے وہ ساجی کی محبت کا اعتراف نہیں کر سکتا۔ اگر ساجی کے فنا ہو جانے کا ذمہ دار خود کو قرار دیتا ہے تو کوئی یقین کرے گا نہیں بالخصوص ساجی کا شوہر دُرجات۔ اس تذبذب کو جس حسن کارانہ اظہار کے ساتھ پیش کیا گیا ہے، اس کو انبساط کے ساتھ دیکھا جا سکتا ہے۔ پوری کہانی یہ ظاہر کرتی ہے کہ ساجی، اخلاقی اور مذہبی اصولوں سے مبرا شخص آدمی کی حیثیت سے جیتے ہوئے دھوبی کا گدھا ہو جاتا ہے۔ نہ گھر کا نہ گھاٹ کا۔

شموئل احمد پیشے سے انجینئر ہیں وہ بھی سول انجینئر۔ اس کے اثرات ان کے یہاں نظر آتے ہیں۔ یہاں ناول کے شروع میں ہی فلیٹ کے ذکر میں بخوبی ان کی تعلیمی مناسبت کو دیکھا جا سکتا ہے جہاں تعمیر کی جزئیات ہے تو اس کا نقص بھی ظاہر ہوتا ہے۔

شموئل احمد علم نجوم سے گہرا شغف رکھتے ہیں۔ اس کا احساس ان کی تحریروں میں ہوتا رہا ہے۔ یہاں بھی کردار کی تفسیر میں ستاروں کے اثرات کو سہارا ہی نہیں بلکہ ستاروں کے اثرات کی اس کی خصوصیت کو شناخت کا وسیلہ بھی بنایا گیا ہے۔ ناول کے ''میں'' کا ذکر اس کے ستارے کے حوالے سے بھی کیا گیا ہے۔ اس کی وضاحت بحسن وخوبی بیان ہوئی ہے۔ ایسے میں ایک نئے آہنگ کا لطف ملتا ہے۔ گرچہ ان کی دوسری تحریروں میں بھی ان کا ایسا ہی انداز اُبھر چکا ہے۔

''گرداب'' میں شموئل کرداروں کو واضح کرنے کے لئے اس کے آگے اس کے منفی اور مثبت رنگ کے کرداروں کو پیش کرتے ہیں۔ یہ انداز ان کے ناول ''ندی'' کی بنیادی سرشت میں مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔ اس ناول میں جزئیات نگاری سے خاطر خواہ کام لیا گیا ہے۔ منظر کو واضح کرنے میں بھی جزئیات نگاری سے دلچسپی لی ہے۔ ان کی اس دلچسپی کی بنا پر کسی قسم کا انمل انداز نہیں ابھرتا ہے۔ منظر بہ منظر جزئیات نگاری زینہ بہ زینہ اگلی منزلوں کی طرف بڑھتی ہے۔

عورت اور عورت کی جنسی نفسیات میں لذت حاصل کرنے کا عمل شموئل احمد کی ترجیحات میں ہے۔ یہاں بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ کبھی کبھی تو لگتا ہے کہ شموئل احمد عورت کی جنسی نفسیات کی زلف پیچاں کو سلجھانے میں اس قدر انہماک سے کام لیتے ہیں کہ پڑھنے والا یہ بھول بھی جاتا ہے کہ یہ فکشن ہے بلکہ حقیقی تاثرات کو محسوس کرنے لگتا ہے۔

''گرداب'' کا مرکزی کردار جب دوسری عورت میں دلچسپی لینے لگتا ہے تو اپنی بیوی سے ہر لحہ خوف زدہ نظر آتا ہے۔ شموئل نے انہیں جذبات کا اظہار اپنے افسانہ ''جھاگ'' میں کھل کر کیا ہے، مگر حسن اظہار کے اعتبار سے دونوں کا رنگ جدا ہے اور لطف آگیں ہے۔

فن کار عورت اور مرد کے بیچ کے رشتے کی سماجی اور تہذیبی کڑیوں پر اپنا سا خیال رکھتا ہے۔ یہاں ناول کے مرکزی کردار اور سماج کے بیچ ناجائز رشتے میں حقیقی رشتے کا اطلاق شموئل احمد کی ہندی صنمیات اور آزاد خیالی کا ساختہ و پرداختہ ہے۔ یہاں ان کے اسلوب وخیال میں درو پدی بھی ہے دوساشن بھی ہے۔ ماحول سازی میں بھی ہندی صنمیات کا اثر واضح ملتا ہے۔ شموئل احمد کا یہ اظہار:

> ''ہر عورت اپنے لاشعور کے نہاں خانوں میں ایک مثالی مرد کی تصویر سجائے رکھتی ہے۔''

اس ناول میں ذات اور مذہب سے الگ تفریق کے مابین بھی ان کا یہ تصور کام کر رہا ہے۔ قارئین چپکے چپکے شموئل احمد کے اشارے پر عورت کو اس کے مثالی مرد کے بہم ہونے کی منزلیں طے ہوتے دیکھتے ہیں۔ ساجی کا مثالی مرد کمار ہے، جس کی پوری حقیقت سامنے نہیں آتی، پر وہ Ideal ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ یہ باتیں بڑی آسانی سے تمام قارئین قبول کر لیں۔ اس پر بحث کے لئے ایک ساتھ کئی دروازے کھل سکتے

PDF Compressor Free Version

ہیں۔ یہاں فن کار کے ناول ''مہاماری'' کا وہ فلسفہ مانع ہوتا ہے، جہاں ذات اور مذہب ہی انسان کی زندگی کا بنیادی محور ہے۔ وہ خیال الگ تھا، یہ تصور الگ ہے۔ ہر چند کہ شموئل احمد کا یہ تصور ان کے افسانوں میں جستہ جستہ نظر آتا رہا ہے۔

مجموعی طور پر ''گرداب'' قارئین کے بیچ اپنی اہمیت منوانے کے لئے ہر اعتبار سے ایک کامیاب تحریر ہے۔ ❁❁

نام کتاب	:	دھند (افسانوی مجموعہ)	
مصنف وناشر	:	ڈاکٹر قیام نیر	
اشاعت	:	۲۰۱۵ء (ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی)	
صفحات	:	۱۵۰	قیمت : ۸۹ روپے
مبصر	:	محسن رضا رضوی	

قیام نیر اردو کے سینئر ادیب ہیں۔ وہ گزشتہ تیس پینتیس برسوں سے اردو کے اہم رسائل وجرائد میں شائع ہو رہے ہیں۔ اہل ادب کے درمیان مختلف ادبی جہات کے سبب مقبول ہیں۔ افسانہ نگاری کے علاوہ ناول نویسی اور انشائیہ نگاری سے بھی علاقہ رکھتے ہیں۔ انشائیوں کا مجموعہ ''میری جو شامت آئی'' (۱۹۹۱ء) اور ناول ''بچھڑی دلہن'' (۱۹۹۳ء) کے علاوہ افسانوں کے دو مجموعے ''تنہائی کا کرب'' (۱۹۸۴ء) اور ''تحفہ'' (۲۰۰۰ء) ان کا ادبی سرمایہ ہیں۔ ''بہار میں اردو افسانہ نگاری'' کے موضوع پر لکھا جانے والا ان کا مقالہ امتحانیہ بہت پہلے (۱۹۹۴ء) کتابی صورت میں شائع ہو چکا ہے اور اس موضوع پر کام کرنے والوں کے لئے آج بھی حوالے کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسی طرح ۲۰۱۴ء میں ان کی ایک اور اہم کتاب ''بہار میں تخلیقی نثر'' دو جلدوں میں شائع ہوئی ہے اور اب ان کا تازہ افسانوی مجموعہ ''دھند'' باذوق قارئین کو دعوت مطالعہ دے رہا ہے۔

قیام نیر بنیادی طور پر افسانہ نگار ہیں۔ مثبت اور صالح انسانی قدریں انہیں عزیز ہیں۔ ان کے افسانوں کا بہ نظر غائر جائزہ لینے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا تخلیقی گراف بتدریج ارتقا پذیر رہا ہے۔ زندگی کے مختلف رخ اور حیات کی مختلف جہتیں اور نیرنگیاں ان کے افسانوں میں

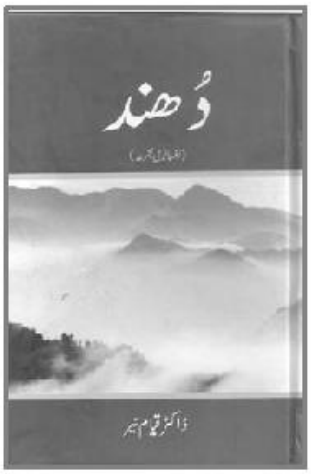

نقطہ نقطہ پھیلتی نظر آتی ہیں اور قاری کو اس فضا میں لے جاتی ہیں جہاں انسانی اقدار آج بھی سربرہنہ ہیں، مگر محسوس کیا جاسکتا ہے کہ قیام نیر اقدار کی اس سربرہنگی سے قطعاً مایوس نہیں۔ وہ ہمارے سامنے محض آئینہ نہیں رکھتے بلکہ وہ اعلیٰ سماجی اقدار کے فروغ وارتقا کے آرزومند ہیں، اس لحاظ سے ان کا ہر افسانہ امید افزا احساسات کا ضامن نظر آتا ہے۔

قیام نیر کے افسانوں کا انداز بیانیہ ہے۔ ان میں مقصدیت کا پہلو صاف دیکھا جاسکتا ہے۔ ساتھ ہی یہ افسانے سماجی عوامل سے بھرپور نظر آتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں بیجا طوالت اور بھرتی کے الفاظ سے بھی گریز ملتا ہے اور عبارتوں میں ژولیدگی اور ابہام بھی نہیں کے برابر ہے، البتہ کہیں کہیں پیش پا افتادگی کی فضا آجاتی ہے۔

قیام نیر نے خود لکھا ہے کہ انہوں نے اپنے افسانوں کے ذریعہ معاشرے میں بکھرے ہوئے واقعات وحادثات، انسانی رشتوں کی بے حرمتی، قول وفعل میں تضاد، شکست آرزو اور عام انسانوں کی مجبوری اور بے بسی کو زبان دینے کی کوشش کی ہے۔ اس مجموعے کی تقریظ پروفیسر شہزاد انجم نے لکھی ہے۔ موصوف کا خیال ہے کہ قیام نیر کے افسانوں کی پہلی قرأت ہمیں چونکاتی ہے۔ ذرا دیر کو ہم یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ کیا واقعی سماج میں اس طرح کے واقعات روزمرہ زندگی میں رونما ہو رہے ہیں۔

انیس افسانوں پر مشتمل زیر نظر مجموعہ ''دھند'' قومی کونسل برائے فروغ زبان اردو کے مالی تعاون سے شائع ہوا ہے اور صاف کاغذ، عمدہ کمپوزنگ اور مضبوط جلد سازی کے ساتھ اس کی طباعت عمل میں آئی ہے۔

باذوق قارئین کو ''دھند'' کے افسانوں کی قرأت کے درمیان کسی قسم کی اکتاہٹ یا وقت کے زیاں کا احساس نہیں ہونا چاہئے۔ کتاب خرید کر پڑھنے کی سفارش کی جاسکتی ہے۔ ❁❁

PDF Compressor Free Version

ہماری سرگرمیاں

اکادمی مجلس عاملہ کی اعلیٰ سطحی نشست میں اہم فیصلے

اردو اکادمی سبھی یونیورسیٹیوں کی کمیاب اردو نصابی کتابیں شائع کرے گی (مشتاق احمد نوری)

پٹنہ: بہار اردو اکادمی کے سمینار ہال میں، وزیر اقلیتی فلاح حکومت بہار و کارگزار صدر اکادمی کے زیر صدارت، ۲۰ ستمبر ۲۰۱۶ء مجلس عاملہ کی ایک اعلیٰ سطحی نشست کا انعقاد ہوا۔ اس موقع پر سکریٹری اکادمی کے ذریعہ وزیر محترم کی خدمت میں گلدستہ پیش کیا اور نشست کی کارروائی کا باقاعدہ آغاز کرتے ہوئے۔ سکریٹری موصوف نے اپنے تازہ عزائم اور ترقیاتی فنڈ کے سلسلے میں حالیہ کاوشوں کا مختصر تذکرہ کرتے ہوئے اعداد و شمار کی روشنی میں ضروری صورت حال سے حاضرین کو آگاہی دی۔

اس کی نشست میں گزشتہ 10 فروری 1916ء کی نشست میں لئے گئے فیصلوں کی توثیق کے بعد یکے بعد دیگرے متعدد نئے اور تازہ ایجنڈوں پر تبادلہ خیال کیا گیا اور اہم فیصلے لئے گئے۔ ان ایجنڈوں کا تعلق ''اکادمی آپ تک'' پروگرام کی پیش رفت، مسودوں پر اشاعتی اعانت، کتابوں پر انعامات، مختلف کتابوں کی تیاری کے پروجیکٹ، تراجم کتب و مضامین، اکادمی کے خبر نامہ کی نشاۃ ثانیہ، ادبی و علمی ایوارڈ، اردو لائبریری، معذور قلم کاروں کی اعانت، اردو انجمن اور اداروں کو مالی تعاون، مختلف نوعیت کی تقریبات کے انعقاد، مختلف اضلاع میں اکادمی کی شاخ کے قیام، اکادمی مطبوعات کی فروخت و نمائش، اردو تربیتی کورس، اردو طلبا و طالبات کے لئے اسکالرشپ کے اجرا اور نئی نسل کے شعرا و ادبا کی علمی و فنی ترقی کے لئے تربیتی پروگرام جیسے امور سے تھا۔

مجلس عاملہ کی اس نشست میں اکادمی خبر نامہ کے جلد سے جلد اجرا کا فیصلہ کیا گیا اور اس کے لئے سبھی ممبران نے ڈاکٹر ریحان غنی کو مدیر بنانے کا مشورہ دیا اور مجلس عاملہ نے اس تجویز پر اپنی منظوری دی۔ اس نشست میں وزیر موصوف نے اس بات پر زور دیا کہ ہمیں ایسا لائحہ عمل بنانے کی ضرورت ہے کہ ہم اردو والے اپنی زبان کی اہمیت سمجھ سکیں اور ہماری نئی نسلیں کسی بھی طرح اردو سے بلند نہ رہے۔ اس موقع پر سکریٹری اکادمی نے اپنے اس عزم کا اعادہ کیا کہ نصابی کتابیں اگر مہیا ہوں تو اکادمی انہیں ترجیحی طور پر شائع کرے گی اور نا خواندگان و نوخواندگان کے لئے لٹریچر کی تیاری میں بھی خصوصی دلچسپی لی جائے گی۔

اس سلسلے میں سکریٹری اکادمی جناب نوری نے سبھی صدر شعبہ اردو سے گزارش کی کہ وہ اپنی اپنی یونیورسٹی کے اردو نصاب کی کمیاب کتابیں اکادمی کو دستیاب کرادیں تاکہ اکادمی انہیں جلد سے جلد شائع کر سکے۔

مجلس عاملہ کی اس اعلیٰ سطحی نشست میں اکادمی کے نائب صدور جناب سلطان اختر اور پروفیسر اعجاز علی ارشد نیز سکریٹری اکادمی جناب مشتاق احمد نوری اور ڈاکٹر خالد مرزا ڈائرکٹر ہائر ایجوکیشن کے علاوہ مجلس عاملہ کے ممبران پروفیسر جاوید حیات صدر شعبہ اردو پٹنہ یونیورسٹی، ڈاکٹر انیس صدری صدر صدر شعبہ اردو متھلا یونیورسٹی، دربھنگہ، ڈاکٹر سید احمد قادری، ڈاکٹر زرنگاری یاسمین، ڈاکٹر عابد رضا نقوی، پروفیسر ظفر کمالی، زیڈ اے اسلامیہ کالج، سیوان، ڈاکٹر نبی احمد، صدر شعبہ اردو جے پرکاش نرائن یونیورسٹی، چھپرہ، ڈاکٹر اقبال اختر، الشمس ملیہ کالج، ارریہ، ڈاکٹر فصیح الدین احمد صدر شعبہ اردو، آر جے ایم کالج، سہرسہ، پروفیسر نگہت خانم، صدر شعبہ اردو تلکا مانجھی یونیورسٹی، بھاگلپور، پروفیسر نفیس فاطمہ صدر شعبہ اردو، بہار یونیورسٹی، مظفر پور، پروفیسر محمد توقیر خاں، صدر شعبہ اردو، ویر کنور سنگھ یونیورسٹی، آرا نے شرکت کی، ساتھ ہی ساتھ اس نشست میں ڈاکٹر قاسم خورشید، ڈاکٹر ریحان غنی، سید شہباز عالم اور سید راشد احمد نے بھی مدعوین خصوصی کے طور پر حصہ لیا۔

PDF Compressor Free Version

سلام و پیام

☆ محترم! آپ سے فون پر بات کرکے بے حد خوشی ہوئی۔ آپ دن رات انتھک محنت کرکے بہار اردو اکادمی کی خدمت انجام دے رہے ہیں اور بطور خاص رسالہ ''زبان و ادب'' کا معیار بھی آپ نے بلند کیا ہے۔ اللہ سے دعا ہے کہ آپ کو صحت عطا کرے اور زیادہ سے زیادہ خدمات انجام دینے کی توفیق بخشے۔ آمین!

کمال جعفری، نئی دہلی

☆ ''زبان و ادب'' آپ کی ادارت میں شائع ہونے کے بعد نکھر گیا ہے۔ آپ ایک تجربہ کار افسانہ نگار، ادیب، صحافی اور سرکاری ملازم ہیں۔ آپ کو ادبی رسالہ نکالنے کا فن آتا ہے۔ گزارش ہے کہ نئے موضوعات پر مضامین شائع کیجئے۔ خصوصاً بہار کے قلم کاروں پر جن کی ادبی نسل ۱۹۰۰ء کے بعد منظر عام پر آئی۔ جمیل مظہری، اجتبیٰ رضوی، مظہر امام، کلیم الدین احمد، اختر اورینوی، عبدالمغنی وغیرہ پر ڈھنگ کے مقالے آنے چاہیے۔ جمیل مظہری کی مثنوی ''آب و سراب'' کا نظریاتی مطالعہ ہونا چاہئے۔ اجتبیٰ رضوی کی مجموعی شاعری اب تک ناقد کے انتظار میں ہے۔ مظہر امام کی غزلیں بھی منصفانہ نقد کی متقاضی ہیں۔ کلیم الدین احمد اور عبدالمغنی کی تنقید نگاری کو معروضی نقطۂ نظر سے دیکھنے کی ضرورت ہے۔ نو آبادیاتی ادبی رویوں کی چھان پھٹک کا وقت آچکا ہے۔

جمال اویسی، دربھنگہ

☆ عزیز گرامی! میں گزشتہ دنوں شہر اورنگ آباد گیا ہوا تھا وہاں میرے عزیز دوست اور معروف افسانہ نگار و ناول نگار جناب نورالحسنین سے ''زبان و ادب'' کا تازہ شمارہ مجھے ملا۔ یہ مجلّہ میرے زیر مطالعہ ہے اس کے مضامین، افسانوں اور شعری تخلیقات نے اپنی طرف متوجہ کر رکھا ہے۔ یہاں کے ادبی حلقوں میں بھی یہ کافی دلچسپی سے پڑھا جارہا ہے۔

اقبال مجید اللہ، پربھنی، مہاراشٹر

☆ مجلّہ ''زبان و ادب'' آپ کی ادارت میں آنے کے بعد ادبی و ثقافتی اور فنی و فکری ہر لحاظ سے نکھرتا جارہا ہے اور ہر شمارہ کئی اضافی خوبیوں کے ساتھ نظر آتا ہے۔ ہر ضلع کے تین بزرگ ادبا و شعرا کو نوازکر آپ نے اردو ادب کے فروغ میں جو محبت دکھائی ہے، وہ ضرور آپ کو زندہ رکھے گی۔ اس شاہکار قدم کے لئے تمام اراکین اور معاونین کو بھی مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ اپریل کے شمارے میں میرا خط شائع ہوا اور اگست کے شمارے میں میری دو غزلیں بھی مع تصویر شائع ہوئیں، اس حوصلہ افزائی کے لئے آپ کا بہت بہت شکریہ! ستمبر ۲۰۱۶ء کا شمارہ بھی دستیاب ہوا۔ تمام مشمولات قابل تعریف ہیں۔ ''سلام و پیام'' میں جناب شکیل سہسرامی نے جس خلوص کے ساتھ میری حوصلہ افزائی کی ہے، اس کے لئے میں ان کا بہت ممنون و مشکور ہوں۔

(ڈاکٹر) ذکی ہاشمی، گوپال گنج

☆ ''زبان و ادب'' ستمبر ۲۰۱۶ء باصرہ نواز ہوا۔ ہر ماہ کی طرح اس بار بھی سرورق پر شائع نایاب تصویر کو چند لمحوں تک بغور دیکھتا رہا۔ بلاشبہ ہر شمارے میں سرورق کی تصویر آپ کے فن کارانہ ذہن کی بھرپور ترجمانی کرتی ہے۔ ''حرف آغاز'' کے تحت آپ نے ایک سال کے عرصے میں، اکادمی اور فروغ اردو کے سلسلے میں اپنے ذریعہ کئے گئے کاموں کا ایمانداری اور بے باکی سے محاسبہ پیش کیا ہے، یہ بڑی بات ہے۔ یہ جان کر بے حد مسرور ہوا کہ آپ جلد ہی ''بچوں کا زبان و ادب'' الگ سے شائع کرنے کے لئے کوشاں ہیں، یہ ایک تاریخی قدم ہوگا۔ رب العزت آپ کی مدد فرمائے اور خدا کرے وہ دن جلد آئے۔ آمین! زیر نظر شمارے میں سبھی مقالات معیاری اور قابل مطالعہ ہیں۔ فیروز عابد کے افسانہ ''نرم لہجے کا فسوں'' اور بلراج بخشی کے افسانہ ''قرابت دار'' میں حالات حاضرہ کی بھرپور عکاسی کی گئی ہے۔ شمیم قاسمی کی غزلیں دل کو چھو گئیں۔ تحسین روزی کی نظم ''علم'' بچوں کے لئے نہ صرف دلچسپ ہے بلکہ نصیحت آمیز بھی ہے۔

قیصر زاہدی، عالم گنج، پٹنہ

☆ ''زبان و ادب'' ماہ اگست ۲۰۱۶ء کا شمارہ ملا۔ بیرون ملک قلم کاروں کی شرکت نے واقعی رسالے کو عالمی سطح پر پہنچا دیا ہے، اس کے لئے مبارکباد قبول فرمائیں۔ آپ کی ادارت میں رسالے کے معیار و

PDF Compressor Free Version

مزاج میں جو تبدیلی آئی ہے وہ لائق تحسین اور قابل تقلید ہے۔ مضامین کے باب میں ابوالکلام قاسمی اور پروفیسر قدوس جاوید وغیرہ کا جواب نہیں تو باب افسانہ میں غزالہ پرویز، غزالہ قمر اعجاز، انور نزہت اور قیصر زاہدی نے دل کے تاروں کو جھنجھوڑ دیا۔ یہ سب مبارکباد کے مستحق ہیں۔ شعری حصہ بھی حسب سابق بھرا پورا اور اثر انگیز ہے۔

معین الدین عثمانی، جل گاؤں، مہاراشٹر

☆ ''زبان و ادب'' (اگست ۲۰۱۶ء) ملا، دیکھ کر جی خوش ہوا۔ آپ نے جریدے کو بین الاقوامی بنا دیا ہے۔ بزرگ شعرا و ادبا کی جیسی پزیرائی آپ کر رہے ہیں، اس کی مثال مشکل سے ملے گی۔ اللہ آپ کو اس کا اجر دے، آمین! پروفیسر قدوس جاوید کا مقالہ ''تخلیقیت اور شاعری کا طلسم'' حاصل شمارہ کہا جا سکتا ہے۔ شعری حصے میں سیدہ شانؔ معراج کی دونوں غزلیں بہت اچھی ہیں۔ بہت خوب ہے۔ انور نزہت کا افسانہ ''بدلتے رشتے'' اچھا ہے، لیکن موصوفہ نے جگہ جگہ ''بارات'' لکھا ہے جب کہ اصل لفظ ''برات'' ہے۔ لفظ ''تماشا'' کو ''تماشہ'' لکھا ہے۔ ''تقاضا'' کو بھی ''تقاضہ'' لکھنا عام ہوتا جا رہا ہے۔ اسی طرح افسانہ ''حیات انسانی کا نوحہ'' میں املا اور زبان و بیان کی غلطیاں ہیں مثلاً ''لڑکے نے حامی بھری تھی۔'' یہاں ''ہامی'' لکھنا چاہئے تھا۔ ''حامی'' تو مددگار کے معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے۔ ایک جگہ لکھا ہے: ''اور مارے گھبراہٹ میں اس نے کال بیل دبا دی'' لفظ ''پہناوا'' کو ''پہراوا'' لکھا ہے، اسی طرح کی اور بھی خامیاں ہیں۔ مجموعی طور پر شمارہ اچھا ہے۔ آپ پرچے پر بہت محنت کر رہے ہیں جس کی داد نہ دینا حق تلفی ہوگی۔ میرے مزاحیہ مضمون ''احتیاط کا خبط'' کے سلسلے میں آرہے ایس۔ ایم۔ ایس اور فون سے رسالے کی مقبولیت کا اندازہ ہو رہا ہے۔ آپ کا اداریہ پر مغز ہوتا ہے، میری دلی مبارکباد قبول فرمائیں۔

فضل حسنین، الہ آباد

☆ ''زبان و ادب'' (اگست ۲۰۱۶ء) باصرہ نواز ہوا۔ بہت ہی خوبصورت اور دیدہ زیب ٹائٹل کے ساتھ، یہ شمارہ بصیرت افروز مضامین سے مزین ہے۔ غزلیات کا حصہ بھی قابل تحسین ہے۔ خصوصی طور سے نصرتؔ مہدی، سیدہ شانؔ معراج اور سعیدؔ رحمانی نے متاثر کیا۔ انور شمیم کی منتخب آٹھ نظمیں اور سید تحسین گیلانی اور سلیم شہزاد کی منظومات بھی عمدہ ہیں۔ سبھی افسانے پڑھ کر طبیعت خوش ہوگئی۔ ''حیات انسانی کا نوحہ'' حقیقت پر مبنی اور انسان کی زندگی کا بہترین بیانیہ ہے۔

احمد رشید، علی گڑھ

☆ ''زبان و ادب'' (اگست ۲۰۱۶ء) پیش نظر ہے۔ رسالہ دن بہ دن خوب سے خوب تر ہوتا جا رہا ہے۔ اس میں شامل مضامین و اشعار آپ کے نظر انتخاب کی بہترین مثال ہیں۔ پروفیسر محمد انوار الحق تبسم کا مضمون ''پورنیہ: تہذیب و ثقافت کے کچھ پہلو'' اپنے موضوع پر بھرپور ہے کیونکہ انہوں نے پورنیہ کی تہذیب و ثقافت کے کچھ ایسے پہلو قارئین کے سامنے رکھا ہے اور ان شخصیات کو ہمارے روبرو کیا ہے جن سے ہم انجان تھے۔ اس کے علاوہ دیگر مضامین اور اشعار بھی قابل مطالعہ ہیں۔

اقبال احمد، خدا بخش لائبریری، پٹنہ

☆ ''زبان و ادب'' (اگست ۲۰۱۶ء) موصول ہوا، شکریہ! آپ کا اداریہ بہت خوب ہے، کیونکہ آپ نے قدیم سے جدید تک کے حالات و نظریات پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے اور اپنی فکری و ادبی کاوش کے ذریعہ ہم قلم کاروں کو اپنی ذمہ داری ادا کرنے کی تلقین بھی کی ہے۔ یہ بات بالکل سچ ہے کہ آپ کی نگرانی میں جب سے ''زبان و ادب'' شائع ہو رہا ہے، سرورق سے لے کر اشاعت و طباعت تک اس کی جاذبیت اور اس کے حسن میں چار چاند لگ گئے ہیں اور تشنگان ادب اور قارئین کے دلوں میں اس کی چاہت بڑھ گئی ہے۔ زیر نظر شمارے میں ابوالکلام قاسمی، پروفیسر طیب صدیقی اور پروفیسر قدوس جاوید کی معلوماتی تحریر اور غزالہ پرویز، غزالہ قمر اعجاز، انور نزہت اور قیصر زاہدی کے افسانے اور سید ضیاء الرحمٰن ضیاؔ، سعید رحمانی، ڈاکٹر ذکی ہاشمی اور شبانہ عشرت کی غزلیں اور انجمؔ باروی کی رباعیاں اچھی لگیں۔

منظر عالم، ریونڈھا، دربھنگہ

☆ بہار اردو اکادمی نے اپنے حالیہ ایام میں رسالہ ''زبان و ادب'' کے ٹائٹل پیج سے لے کر مضامین کے انتخاب اور تحریکی سرگرمیوں تک جس طرح سمبولک، جمالیاتی اور ارتقائی بلندیوں کی جانب پرواز کی

PDF Compressor Free Version

کدوکاوش کی ہے وہ اس بات کا متقاضی ہے کہ اس پر خامہ فرسائی کی جائے جو اس تحریک کو مہمیز دینے کے مترادف ہے۔ میرے سامنے فروری، مارچ اور مئی ۲۰۱۶ء کے ''زبان و ادب'' کے شمارے ہیں۔ اکادمی نے ہر ماہ کے ''زبان و ادب'' کے شماروں میں ٹائٹل پیج پر جو تصاویر دی ہیں وہ سمبولک بھی ہیں اور حسین بھی جو مدیر اور اداراتی عملے کے حسن ذوق کا نمونہ ہیں۔ صرف یہی نہیں بلکہ یہ تصاویر تدبر و تفکر کی بھی داعی ہیں، جو عام قاری کے حسن ذوق کی تسکین کا سامان بھی فراہم کرتی ہیں اور خاص طور سے ننھے قارئین کو سائنس و ٹکنالوجی کی طرف رغبت بھی دلانے والی ہیں۔ یہ تصاویر جہاں جریدے کو حسین و لطیف بناتی ہیں وہیں دوسری طرف ہماری ننھی نسل، فکر و تدبر اور سائنس اور مختلف علوم و فنون میں غوطہ زنی کے مواقع فراہم کرتیں اور ان علوم و فنون کو جاننے اور پرکھنے اور ان کے حصول کا داعیہ بھی پیدا کرتی ہیں۔ جہاں تک اردو زبان و ادب کے انحطاط کا سوال ہے۔ میں رسالہ ''زبان و ادب'' کے ماہ فروری اور مئی ۲۰۱۶ء کے اداریے میں سکریٹری اکادمی کے بیان کردہ کرب کی گہرائی کو سمجھ سکتا ہوں۔ یہ حقیقت ہے کہ اردو زبان کے انحطاط پر ہم اپنی نجی نشستوں میں باتیں تو کرتے ہیں، لیکن اس کی بقا اور ترقی و ترویج و ترسیل کے لئے کوئی اجتماعی یا مبسوط کوشش تو کیا انفرادی طور پر بھی شاذ و نادر ہی کچھ کر پاتے ہیں۔ میں سکریٹری بہار اردو اکادمی کی اس رائے سے اتفاق کرتا ہوں کہ ''ہمیں یہ بھی احتساب کرتے رہنا چاہیے کہ ہم نے ذاتی طور پر اس سلسلے میں اب تک کیا کچھ کیا ہے اور کر رہے ہیں۔'' جب ہم اردو کی زبوں حالی کا تجزیہ کرتے ہیں تو دوسروں کے بجائے خود اپنا تصور زیادہ نکل آتا ہے۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے کہ جس کا ہم جتنا بھی ماتم کریں کم ہے۔ اس ضمن میں ماہ مئی ۲۰۱۶ء کے ''زبان و ادب'' کے شمارے میں شائع مضمون بہ عنوان ''اردو کی عصری صورت حال'' میں مضمون نگار جناب غضنفر نے جو حالات بیان کئے ہیں اور جو اعداد و شمار پیش کئے ہیں وہ اردو دوستوں کو خون کے آنسو رلا دینے کے لئے کافی ہے۔ انہوں نے اپنے اس مبسوط مضمون میں اردو زبان و ادب کے انحطاط کے وجوہات پر بھی سیر حاصل روشنی ڈالی ہے اور مرض کا علاج بھی بتایا ہے۔ انہوں نے اردو دانوں کے احساس کمتری پر روشنی ڈالتے ہوئے یہ لکھا ہے کہ ''پتہ نہیں کیسے اردو والوں کے اندر یہ بات بیٹھ گئی ہے کہ اردو بولنے، پڑھنے اور لکھنے سے شخصیت کی پیشانی پر پشیمانی کا لیبل لگ جاتا ہے۔'' وہ اردو کی زبوں حالی کی ایک بڑی وجہ اس نظریہ پشیمانی کو قرار دیتے ہیں۔ وہ اس کی وضاحت کرتے ہوئے مزید کہتے ہیں کہ وہ اردو داں بھی جو اردو میں بہتر طریقے سے مختلف موضوعات پر اظہار خیال پر قادر ہیں، انگریزی کے غلبے اور رعب کی وجہ سے اپنے خیالات کا اظہار کرنے سے قاصر رہ جاتے ہیں اور نتیجتاً انگریزی یا ادھ کچری انگریزی میں رواج پانے والے کمتر اور گمراہ کن افکار و خیالات معاشرے میں اپنے اثرات قائم کر لیتے ہیں۔ یہ فکری اور معاشرتی انحطاط کا نادر نمونہ نہیں تو اور کیا ہے؟ مضمون نگار نے مسلمانوں کے ایک نمائندہ علمی مرکز علی گڑھ میں بھی اردو کی زبوں حالی کے اعداد و شمار پیش کیا ہیں۔ یہ ہمارے لئے کسی بڑے المیے سے کم نہیں، لیکن ابھی بھی حالات ایسے نہیں کہ ہم بالکل مایوس ہو جائیں۔ مختلف شہروں میں اردو نوازوں نے چھوٹی چھوٹی انجمنیں قائم کر رکھی ہیں، جنہوں نے اردو کی شمع روشن کر رکھی ہے، لیکن انہیں وسیع کینوس پر کام کرنے اور کاوشوں کے سلسلے کو دراز کرنے کی ضرورت ہے۔ جناب مشتاق احمد نوری نے ''زبان و ادب'' کے ماہ فروری ۲۰۱۶ء کے اداریے میں وزیر اقلیتی فلاح ڈاکٹر عبدالغفور کے مشوروں اور کوششوں کے حوالے سے لکھا ہے کہ وزیر موصوف نے اردو لائبریریوں کے ذریعہ عربی اردو کے تعلیمی نظام کو ایک نئی جہت دینے کی کوشش کی ہے۔ اس کے تحت اردو اکادمی کے ساتھ اردو لائبریریوں کا الحاق کرتے ہوئے انہیں کتابوں کی مدد کے ساتھ ساتھ کچھ رقوم بھی دی جائیں گی، جس کے ذریعے ان لائبریریوں میں اردو اور عربی کی تعلیم کا نظم کیا جائے گا اور اکادمی کی دی گئی رقوم سے ایسے اساتذہ کو اعزازیہ بھی دیا جائے گا۔ میں یہاں ''اکادمی آپ تک'' کی تحریک کی کھلے دل سے تعریف کرنا چاہتا ہوں کہ اس نے ضعیفی کی سرحدوں میں پہونچ جانے والے پرانے مصنفین، شعرا اور ادبا کی جس طرح انہیں تک پہنچ کر ان کی عزت افزائی کی ہے اور ان پر مقالے اور تبصرے

PDF Compressor Free Version

پیش کیے ہیں وہ قابل صد ستائش ہے۔ اکادمی کے سکریٹری جناب مشتاق احمد نوری کا ایک اوپن لیٹر جناب شکیل الرحمٰن کو جواب خلد آشیانی ہو گئے، ان کی گڑگاؤں واقع رہائش گاہ پر جا کر انہیں اکادمی کے سب سے بڑے ایوارڈ ''سید سلیمان ندوی ایوارڈ'' سے نوازنا یقیناً ایک بہت ہی مستحسن قدم ہے۔ اس سے جہاں ایک طرف ضعیف العمر ادبا اور شعرا کو دلی خوشی ہے یہ سوچ کر کہ ان کی سدھی لینے والے لوگ ابھی ہیں اور اکادمی ان کے بارے میں متفکر ہے، وہیں دوسری طرف نئی نسل کے شعرا و ادبا کی اس سے ہمت افزائی بھی ہوئی ہے۔ ایک بار پھر کہوں کہ یہ اکادمی کا بہت ہی مستحسن قدم ہے اور اس کے اعادے کی یقین دہانی نئی شمعیں روشن کرتی ہے۔ ''بچوں کا زبان و ادب'' بھی پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھے جانے کے لائق ہے۔ گو کہ اس میں ننھے مصنفین کو جگہ دی گئی ہے، لیکن ان کی شمولیت اور بڑھنی چاہیے۔ اردو کے پرستاروں سے درخواست ہے کہ وہ اپنے بچوں کی اس سمت میں ہمت افزائی کریں اور اصلاحی تحریروں پہ زور دیا جائے تاکہ بچوں کی بہتر تربیت ہو سکے۔ جہاں تک صحت مند اور اصلاحی تحریروں کا سوال ہے، یہ صرف بچوں کی ہی ضرورت نہیں بلکہ نئی نسل کی خصوصاً اور ہم تمام لوگوں کی عموماً یہ ایک بہت اہم ضرورت ہے اور کبھی کبھی کوئی ایک جملہ ہمارے فکر و عمل کو یکسر بدل دینے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

عبدالباری، ریٹائرڈ اے ڈی ایم، ہزاری باغ

☆ ''زبان و ادب'' جولائی ۲۰۱۶ء موصول ہوا تھا، ظفر نوازی کا شکریہ! رسالہ صوری و معنوی دونوں اعتبار سے دیدہ زیب، وقیع اور معیاری ہے جو قارئین کی توجہ مبذول کراتا ہے۔ یہ شمارہ اس اعتبار سے اور بھی وقیع اور پرکشش ہو گیا ہے کہ یہ اردو کے عظیم افسانہ نگار جوگیندر پال کے گوشے پر مشتمل ہے۔ جوگیندر پال اس صدی کے ایک بلند پایہ افسانہ نگار اور انتہائی مخلص و ملنسار انسان تھے۔ کافی عرصہ ہوا، میری ان سے ایک ملاقات دہلی میں ان کی رہائش گاہ پر احمد زین الدین صاحب، مدیر ''روشنائی'' کراچی کے ساتھ ہوئی تھی۔ ان دنوں احمد زین الدین صاحب ''روشنائی'' کا ''افسانہ صدی نمبر'' ترتیب دے رہے تھے۔ اس طرح ان سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا تھا۔ وہ انتہائی خلوص اور شفقت سے پیش آئے۔ ایسی شخصیتیں کمیاب ہیں۔ اب وہ ہمارے درمیان نہیں ہیں تو ان کی کمی شدت سے محسوس کی جائے گی۔ ان کے فن اور شخصیت کے سلسلے میں زیر نظر شمارے میں کئی اہم مضامین شامل ہیں۔ خصوصاً دیپک بدکی صاحب کا مضمون ''جوگیندر پال کے افسانے مٹی کا اور اک کے حوالے سے'' بہت اہم مضمون ہے۔ بدکی صاحب نے کافی گہرائی سے ان کی کہانیوں کا مطالعہ کر کے مضمون قلم بند کیا ہے جو انتہائی جامع اور دل نشیں ہے۔ ان کے علاوہ بدنام نظر، احمد علی جوہر اور ڈاکٹر رضوان احمد اعجازی کی تخلیقات بھی اہمیت کی حامل ہیں۔ ڈاکٹر نریش کا مضمون ''کرشن چندر: کچھ یادیں، کچھ باتیں'' انتہائی تاثراتی مضمون ہے جو پڑھنے پر مجبور کرتا ہے۔ دیگر مضامین بھی قاری کی توجہ راغب کرتے ہیں۔ شعری حصہ معیاری اور عمدہ ہے، کئی اشعار نے متاثر کیا۔ نظمیں خوبصورت ہیں خصوصاً تبسم فاطمہ کی نظم ''کہیں دبائی جا رہی ہے ایک چیخ'' کافی تاثراتی نظم ہے۔ افسانے خاص طور سے ڈاکٹر نکہت تبسم اور شاکر کریمی کے افسانے بہت عمدہ ہیں۔

ظفر اقبال ظفر، فتح پور، یوپی

خریداروں کے لئے ضروری اطلاع

☆ محکمہ ڈاک نے انڈر پوسٹنگ سرٹیفکیٹ سسٹم ختم کر دیا ہے، لہٰذا خریدار حضرات کو اب سادہ ڈاک سے رسالہ بھیجا جاتا ہے۔ رسالہ کی گمشدگی کے لئے ادارہ پر کسی طرح کی کوئی ذمہ داری اور باز پرس نہیں ہوگی۔ اگر رجسٹرڈ پوسٹ سے رسالہ منگانا چاہتے ہوں تو اس کے لئے زر سالانہ ۳۵۰ روپے ہوگا۔

☆ اس دائرے میں سرخ نشان کا مطلب ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہو چکی ہے۔ اگر اگلے سال کا زر سالانہ آپ سے موصول نہیں ہوا تو یہ سمجھا جائے گا کہ آپ آگے خریدار بنے رہنا نہیں چاہتے۔ (سرکولیشن انچارج)

PDF Compressor Free Version

بچوں کا
زبان وادب

☆	دعا	صبا نقوی	۷۴
☆	لالچ بری بلا ہے	مہدی پرتاب گڑھی	۷۴
☆	سارے جہاں میں دھوم ہماری زبان کی ہے	صالحہ سنبل	۷۵
☆	گھمنڈ کا انجام	انصاری محمد یاسین نذیر احمد	۷۷
☆	واقعہ کربلا اور عظمت حسین	منظر عباس	۷۸
☆	آؤ ہم بازار چلیں	محسن باعشن حسرت	۷۹
☆	جن کی شادی	نکہت جہاں	۸۰

PDF Compressor Free Version

صبا نقوی

محلہ کمرہ، نزد فائر اسٹیشن، مظفرپور 842001

دعا

معصوم دل کی ہے دعا ، یارب! بحق مصطفیٰ
جود و سخا کے نام پر ، لطف و کرم کی بھیک دے
معصوم دل کی ہے دعا ، یارب! بحق مصطفیٰ
حسن عطا کے نام پر لوح قلم کی بھیک دے
معصوم دل کی ہے دعا ، یارب! بحق مصطفیٰ
خاک شفا کے نام پر ، خاک قدم کی بھیک دے
معصوم دل کی ہے دعا ، یارب! بحق مصطفیٰ
کرب وبلا کے نام پر ، عرفان غم کی بھیک دے
معصوم دل کی ہے دعا ، یارب! بحق مصطفیٰ
شیر خدا کے نام پر تیغ دو دم کی بھیک دے
معصوم دل کی ہے دعا ، یارب! بحق مصطفیٰ
بخت رسا کے نام پر ، جاہ و حشم کی بھیک دے
معصوم دل کی ہے دعا ، یارب! بحق مصطفیٰ
خیرالنسا کے نام پر ، خوان ارم کی بھیک دے
معصوم دل کی ہے دعا ، یارب! بحق مصطفیٰ
صدق و صفا کے نام پر ، نازو نعم کی بھیک دے
معصوم دل کی ہے دعا ، یارب! بحق مصطفیٰ
شمع حرا کے نام پر ، نور حرم کی بھیک دے
معصوم دل کی ہے دعا ، یارب! بحق مصطفیٰ
مہرو وفا کے نام پر ، مشک و علم کی بھیک دے

مہدی پرتاب گڑھی

28۔اسکول وارڈ پرتاب گڑھ، 230001 (یوپی)

لالچ بری بلا ہے

لالچ سے جو بچا ہے
وہ آدمی بھلا ہے
لالچ کبھی نہ کرنا
لالچ بری بلا ہے
لالچ جو کی تو سب کی
نظروں سے گر گیا ہے
پوری کی کر کے لالچ
آدمی بھی کھو چکا ہے
لالچ نے آدمی کو
کتا بنا دیا ہے
لالچ کو جس بشر نے
دل میں سلا دیا ہے
سچ پوچھئے تو بچو!
وہ آدمی بڑا ہے
کب لالچی بشر کو
کوئی سراہتا ہے
اس سے امید کیا جو
لالچ میں مبتلا ہے
کیا اس کی قدرو قیمت
بندہ جو حرص کا ہے

PDF Compressor Free Version

صالحہ سنبل

67. Colootola Street, Kolkata 700073

سارے جہاں میں دھوم ہماری زبان کی ہے

اردو ہندوستانی زبان ہے، کیوں کہ یہ یہیں عالم وجود میں آئی ہے۔ یہ زبان بہت ہی شریں زبان ہے۔ یہ صرف ہم نہیں کہتے بلکہ اردو کی شیرنی کا اعتراف ساری دنیا کرتی آرہی ہے اور آنے والی نسلیں بھی اس بات کا اعتراف کرتی رہیں گی۔ اس زبان میں نہ صرف بلا کی مٹھاس ہے بلکہ اس میں گنگا جمنی تہذیب کی بے پناہ خوشبو بھی رچی بسی ہے۔ اردو ایک تہذیب یافتہ زبان ہے۔ یہ زبان یوں ہی مہذب نہیں ہوئی۔ اسے آداب وتہذیب سے آراستہ کرنے میں ہمارے بزرگوں نے بڑی جاں فشانی کا مظاہرہ کیا ہے۔ یہی سبب ہے کہ جو بھی شخص اردو کی طرف پیش قدمی کرتا ہے یہ زبان اسے بڑی فراخ دلی کے ساتھ گلے لگالیتی ہے اور رفتہ رفتہ اسے اپنا اسیر کرلیتی ہے۔

یہ زبان اس وقت وجود میں آئی جب ہندوستان میں ترکی اور افغانی فوج اپنا تسلط جما چکی تھی۔ ان کی مادری زبان ترکی اور فارسی تھی جب کہ ہندوستانی قوم ان زبانوں سے نابلد تھی، لہٰذا ایک ایسی زبان کی ضرورت پیش آئی جس کے وسیلے سے ہندوستانی عوام سے آسانی کے ساتھ رابطہ قائم کیا جاسکے۔ بالآخر دنیا کی کئی زبانوں کے اشتراک سے اردو ایک مضبوط زبان کی شکل میں سامنے آئی اور رفتہ رفتہ ہندوستان کے ہر شعبہ حیات میں بولی جانے لگی۔ اس زبان میں اس قدر کشش تھی کہ یہ ہر خاص وعام کو اپنی طرف کھینچتی چلی گئی۔

ہمیں فخر ہے کہ اردو ہماری مادری زبان ہے، کیوں کہ یہ ایک سیکولر زبان ہے۔ اس زبان نے جہاں قلی قطب شاہ، ولی دکنی، میر تقی میر، مرزا غالب، نظیر اکبر آبادی، علامہ اقبال اور جوش ملیح آبادی جیسے عظیم الشان مسلم شعرا سے ہمیں نوازا ہے وہیں پنڈت برج نارائن چکبست، پنڈت دیا شنکر نسیم، رام پرشاد بسمل، تلوک چند محروم، فراق اور کنور مہندر سنگھ بیدی جیسے باکمال ہندو شعرا بھی ہمیں عطا کئے ہیں۔ اس نے جہاں سعادت حسن منٹو، خواجہ احمد عباس، عصمت چغتائی، قرۃ العین حیدر اور انتظار حسین جیسے مسلم ناول نگار ہمیں دیے ہیں وہیں منشی پریم چند، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، اوپندر ناتھ اشک اور بلونت سنگھ جیسے ہندو کہانی کار بھی دیے ہیں، اتنا ہی نہیں بلکہ اس نے جہاں الطاف حسین حالی، شبلی نعمانی، محمد حسین آزاد، کلیم الدین احمد، احتشام حسین، آل احمد سرور، شمس الرحمٰن فاروقی جیسے مسلم ناقدین ومحققین کے فن پاروں سے ہمیں مالا مال کیا ہے وہیں مالک رام، جگن ناتھ آزاد، گوپی چند نارنگ، گیان چند جین، کالی داس گپتا رضا اور شانتی رنجن بھٹا چاریہ جیسے ہندو ناقدین ومحققین کے بھی شہ پاروں سے ہمیں سرافراز کیا ہے۔

ہمیں اپنی مادری زبان پر اس لئے بھی فخر ہے کہ اس نے ہندوستان کی تحریک آزادی میں بیش بہا خدمات انجام دی ہیں۔ اس زباں نے سوئی ہوئی غلام قوم کو جگانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ اس نے آزادی کے متوالوں کو "انقلاب زندہ باد" جیسا پر جوش نعرہ اور

سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے
دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے

جیسا پر جوش شعر بھی عطا کیا ہے۔ یہ نعرہ اور یہ شعر آج بھی ہر تحریک کی روح میں بے پناہ گرم جوشی کی لہر پیدا کردیتا ہے۔ دنیا کی کوئی بھی زبان آج تک اس نعرے اور اس شعر کا بدل پیدا نہ کرسکی۔ اسی زبان نے ہندوستانی قوم کو "سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا" جیسا ترانہ عطا کرکے سربلند کردیا ہے، یہ ترانہ ہماری قومی تقریب میں آج بھی فخریہ انداز میں گایا جاتا ہے اور اس کی بازگشت سارے عالم میں سنائی دیتی ہے۔

پہلے مشاعرے بادشاہوں اور نوابوں کے درباروں تک ہی

PDF Compressor Free Version

محدود ہوا کرتے تھے، لیکن جب عوام الناس سے اس کا رشتہ استوار ہوا تو اس کی شہرت و مقبولیت میں روز افزوں اضافہ ہوتا گیا۔ مشاعروں نے بھی اردو کے فروغ میں اہم رول ادا کیے ہیں۔ غیر اردو داں حضرات مشاعروں کے زیر اثر اردو کی چاشنی سے واقف ہوئے، اردو بولنے اور سیکھنے کی طرف ان کی رغبت بڑھی اور اس طرح مشاعروں کی بدولت اردو داں حضرات کا بہت بڑا حلقہ وجود میں آیا۔

اردو نے جب فلمی دنیا میں قدم رکھا تو اس نے ناقابل فراموش کہانیوں، یادگار مکالموں اور دلوں پر نقش کر جانے والے شاہکار نغموں سے مالا مال کر کے ہندوستانی فلموں کو شہرت کی بلندی پر پہنچا دیا۔ بالی ووڈ میں اردو کی کارگزاری کا یہ سلسلہ آج بھی بدستور جاری ہے اور جاری رہے گا۔ یہ اور بات ہے کہ ہندوستانی فلموں کو اردو کے بجائے ہندی کی سرٹیفکیٹ جاری کی جاتی ہے۔ ہندوستانی غزل گائیکی میں بھی اردو نے کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں۔ اس نے ہزار ہا غزل اسیروں کو اردو سیکھنے پر مجبور کر دیا۔ ان غزل پریمیوں میں کئی نامور شاعر اور ادیب بن کر اردو کے فروغ میں آج بھی حصہ لے رہے ہیں۔

بیشک اردو زبان سیکولر ہے، یہ کسی ایک قوم کی ملکیت نہیں، یہ زبان ہندوستانی قوم کا ورثہ ہے۔ مشترکہ طور پر سبھی قوموں نے اس کے فروغ میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے، یہ زبان دلوں پر حکومت کرنا جانتی ہے۔ اسے دنیا کی کوئی طاقت مٹا نہیں سکتی۔ بیشک یہ بڑی سخت جان اور متحرک زبان ہے۔

اردو زبان ہندوستان کی سرزمین پر پلی بڑھی اور جوان ہو کر نہ صرف پورے ایشیا میں چھا گئی بلکہ یورپ اور امریکہ کے علاوہ دیگر براعظموں میں اپنے شہرت کے باوقار پرچم نصب کرتی جا رہی ہے۔ آج یہ زبان غیر ملکی یونیورسٹیوں میں بھی پڑھائی جا رہی ہے۔ اس زبان نے دنیا بھر میں نہ صرف نئے قارئین پیدا کر دیے ہیں بلکہ ادبا و شعرا کا بہت بڑا لشکر بھی تیار کر دیا ہے، جو اردو کو کامرانی کی مزید بلندیاں فراہم کرے گا۔ داغ دہلوی نے بہت پہلے فرما دیا تھا۔

اردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغ
سارے جہاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے

❁❁❁

آؤ مل کر ہم لگائیں قہقہہ

علقمہ شبلی

(مجموعہ ''تارے زمین کے'' سے ماخوذ)

قہقہہ ہے اک دیا
جس سے روشن زندگی جس سے زندہ آدمی
قہقہہ ہے ایک پھول
جس کی خوشبو جاں فزا رنگ جس کا دل رُبا
قہقہہ ہے ایک گیت
روح جس سے شاد ہے جس سے دل آباد ہے
قہقہہ ہے اک پری
جس کی زد میں آسماں جس سے رنگیں داستاں
قہقہہ ہے ایک چاند
جس سے روشن آج بھی شاہرا ہیں امن کی
آؤ مل کر دوستو
ہم لگائیں قہقہہ

PDF Compressor Free Version

انصاری محمد یاسین نذیر احمد

Abdul Majeed Dalwala Chowk, Mominpura, Malegaun 423203 Dist Nasik, Maharashtra

گھمنڈ کا انجام

ایک پہلوان کشتی لڑنے میں طاق تھا، حتی کہ وہ پہلوانی کے تین سو ساٹھ گر جانتا تھا اور ہر روز ایک نئے داؤ سے کشتی لڑتا۔ شاگردوں میں سے ایک پٹھے کی خوبیوں پر اس کی نظر تھی۔ اس نے اپنے پٹھے کو تین سو انسٹھ گر سکھا دئے، صرف ایک گر باقی رہ گیا تھا۔ اسے یہ گر سکھانے میں وہ ہمیشہ ٹال مٹول سے کام لیتا رہا، وہ نوجوان پہلوانی کے فن میں اس حد تک طاق ہو گیا کہ کسی کو اس کے ساتھ پنجہ لڑانے کی جرأت نہ ہوتی۔

آخر یہ وقت آیا کہ وہ ایک دن بادشاہ سے کہنے لگا کہ:

''جہاں پناہ! اُستاد کو مجھ پر ایک تو عمر میں بڑا ہونے کی فضیلت ہے، دوسرا حق استادی ہے، ورنہ قوت میں، میں اُن سے ہرگز کم نہیں ہوں بلکہ میدانِ پہلوانی میں ان کے برابر ہوں۔''

یہ بڑا بول تھا، بادشاہ کو ناگوار لگا۔ اس نے حکم دیا کہ دونوں کی کشتی کروائی جائے۔ اُن کی کشتی کے لئے ایک وسیع میدان کا انتخاب کیا گیا جہاں امیروں، وزیروں کے علاوہ دور نزدیک کے دوسرے پہلوان بھی آ جمع ہوئے۔

نوجوان مست ہاتھی کی طرح اکھاڑے میں دھماکے سے آیا جیسے راہ میں آنے والے مضبوط پہاڑ کو اکھاڑ پھینکے گا۔ استاد یہ جانتے تھے کہ یہ پٹھا پہلوان قوت میں ان سے زیادہ ہے، اس لئے انہوں نے اسی نادر داؤ سے جو اس سے چھپا رکھا تھا اس کے ساتھ گتھا ہو گئے۔

نوجوان اس کا توڑ نہ جانتا تھا، گھبرا گیا۔ استاد نے اُسے دونوں ہاتھوں سے اوپر اٹھایا اور دھڑام سے زمین پر پٹخ دیا۔ اکھاڑے میں ہر سو تعریف ہونے لگی اور وہ شور بلند ہوا کہ بادشاہ نے استاد کو انعام و اکرام سے نوازا اور شاگرد کو فہمائش کے انداز میں کہا کہ تو اپنے محسن کے مقابلے پر آ گیا اور پھر تجھے منہ کی کھانی پڑی۔ نوجوان نے عرض کیا:

''استاد نے مجھ پر زور سے غلبہ نہ پایا بلکہ مجھ کو پہلوانی کے ایک گر سے واقفیت نہ تھی، لہٰذا یہ کسر باقی رہ گئی جس کے سکھانے میں ہمیشہ استاد نے لیت و لعل (ٹال مٹول) سے کام لیا اور آج اسی داؤ کی وجہ سے مجھے انھوں نے پٹخ دیا۔'' استاد نے کہا:

''ہاں ہاں! میں نے یہ داؤ اسی دن کے لئے بچا رکھا تھا کیوں کہ عقل مندوں نے کہا ہے کہ دوست کو اتنی قوت نہ دو کہ جب وہ دشمنی کرنا چاہے تو وہ دشمنی کرنے کے قابل ہو جائے۔ کیا تم نے وہ قول نہیں سنا جو اپنے ہی پروردہ کے ہاتھوں نقصان اٹھانے پر کسی نے کہا تھا کہ یا تو زمانے میں وفا ہی نہ تھی یا اس زمانے میں کسی نے وفا کی ہی نہیں۔ میں نے آج تک ایسا شاگرد نہیں دیکھا جسے میں نے علم تیر اندازی سکھایا، پھر آخر کار اس نے مجھے نشانہ نہ بنایا ہو۔'' (گلستاں سے ماخوذ)

کار آمد باتیں

☆ غریب وہ ہے جس کا کوئی دوست نہیں

☆ یہ نہ دیکھو کہ کس نے مجھے کیا دیا بلکہ یہ سوچو کہ میں نے کسی کو کیا دیا

☆ وقت، ہوا اور دولت ہمیشہ بدلتے رہتے ہیں

☆ انسان کی عقل کا اندازہ غصہ کی حالت میں لگانا چاہئے

☆ دوسروں کی خوشی اور آرام کے لئے اپنی خوشی اور آرام کو قربان کر دینا انسانیت کی معراج ہے

☆ خوش کلامی ایسا پھول ہے جو کبھی نہیں مرجھاتا

☆ تم خدا کو راحت میں نہ بھولو، وہ تم کو مصیبت میں نہ بھولے گا

PDF Compressor Free Version

منظر عباس

معرفت پیارے حسن، دریاپور، پٹنہ 800004 (Mob. 9308462743)

واقعہ کربلا اور عظمت حسین

محرم الحرام ہجری سال کا پہلا مہینہ ہے۔ یوں تو محرم الحرام کا پورا مہینہ ہی بڑی عظمتوں اور برکتوں والا ہے، لیکن اس کی دسویں تاریخ یعنی عاشورہ کا دن خاص طور سے بہت زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ انبیائے کرام کی زندگی اور تاریخ میں ہونے والے بہت سارے واقعات کے بعد دسویں محرم ہی کو وہ واقعہ بھی ہوا، جسے کربلا کا سانحہ کہا جاتا ہے۔

بیشک محرم الحرام کا مہینہ آتے ہی اس دردناک واقعہ کی یاد تازہ ہوجاتی ہے جب کہ حق کی حفاظت کے لئے رسول پاک کے نواسے حضرت امام حسین، اپنے بہتر (۷۲) ساتھیوں کے ساتھ، کربلا کے میدان میں شہید ہوئے۔ کربلا کی جنگ میں صرف بڑوں اور علی اکبر جیسے کڑیل جوانوں نے ہی شہادت نہیں پائی بلکہ حضرت امام حسین کے صاحبزادے، حضرت علی اصغر کو بھی، جو چھ ماہ کے بچے تھے، یزیدی فوج کے حرملہ نامی بدبخت نے اپنے تیر سے شہید کردیا۔

کربلا کی لڑائی جہاں ایک طرف انتہائی ظلم وستم کی داستان سناتی ہے، وہیں وہ حضرت امام حسین اور ان کے ساتھیوں کی ہمت، ان کے حوصلے اور ان کے صبر پر بھی زمانے کو حیران بنادیتی ہے۔ کربلا کا واقعہ، حسینی لشکر کے کردار کے حوالے سے بیشک انسانیت کی معراج ہے، کیوں کہ اس نے قیامت تک کے لئے ہمیں یہ سکھادیا ہے کہ باطل کے سامنے کبھی سر نہیں جھکانا چاہئے۔ بیشک حضرت امام حسین نے کربلا میں جو عظیم قربانی پیش کی ہے، اسے دنیا قیامت تک یاد کرتی رہے گی۔

حضرت امام حسین کے مقام ومرتبہ کا ذکر بڑے بڑے نامور آدمیوں کے اقوال میں ملتا ہے۔ رابندر ناتھ ٹیگور نے لکھا ہے کہ امام حسین کا روضہ محبت کا مسکن ہے۔ ''تاریخ چین'' کے مصنف جیمس کارکرن کا قول ہے کہ بہادری میں رستم کا نام وہی لیتا ہے جو تاریخ سے ناواقف ہے اور جس نے امام حسین جیسے بہادر کا نام نہیں سنا۔ جرمنی کے معروف دانشور میسو مارمبین نے کربلا میں امام حسین کی شہادت کو ایک ایسا حکیمانہ واقعہ قرار دیا ہے جس کی کوئی دوسری مثال نہیں ملتی۔ سروجنی نائیڈو کے لفظوں میں حضرت امام حسین ایسے بلند انسان ہیں جنہیں پوری دنیا دل وجان سے مانتی ہے اور یہ بات مسلمانوں کے لئے باعث فخر ہے۔ لوگوسلاویہ کے دانشور پھ میسل پیٹر نے لکھا ہے کہ امام حسین کی تاریخی حیثیت بتاتی ہے کہ کوئی نہ کوئی خدائی آواز موجود ہے جو ظالم قوتوں کے سامنے ہر قوم اور ہر ملک کی رہنمائی کرتی ہے۔ لندن کے دانشور لارڈ ہیڈلے کا قول ہے کہ امام حسین کے دل میں سچا اسلامی اور انسانی جذبہ کارفرما تھا، کیونکہ اس جذبے کے بغیر وہ صبر واستقلال اور وہ ہمت وجوانمردی آ ہی نہیں سکتی تھی جو کربلا میں تاریخ نے دیکھا اور جو مثالی حیثیت سے تاقیامت باقی رہے گی۔

ڈاکٹر رادھا کرشنن نے لکھا ہے کہ حضرت امام حسین نے اپنی قربانیوں سے دنیا پر یہ ثابت کردیا کہ حق وصداقت کو زندہ رکھنے کے لئے ہتھیاروں اور فوجوں کی کمی کے بغیر بھی جانوں کی قربانی پیش کرکے ابدی کامیابی حاصل کرجاسکتی ہے۔ مہاتما گاندھی نے آزادی کی لڑائی کے زمانے میں صاف صاف کہا تھا کہ انگریزوں کی غلامی سے نجات کے لئے ہمیں حسینی اصولوں پر عمل کرنا ہوگا۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے لکھا ہے کہ حضرت امام حسین کی قربانی ہر مذہب وملت کے لئے بہترین مشعل ہدایت ہے۔ اردو کے مشہور شاعر جوشؔ نے سچ کہا ہے کہ ؎

انسان کو بیدار تو ہو لینے دو
ہر قوم پکارے گی ہمارے ہیں حسین

PDF Compressor Free Version

محسن باعشن حسرت

4, Princep Street, 1st Floor, Kolkata 700072 (Mob. 9748024426)

آؤ ہم بازار چلیں

چنو منو پپو آؤ! مل کر سب بازار چلیں ہم
بیٹھو مل کر سب ٹم ٹم میں لائن کے اس پار چلیں ہم

پہنچے ہیں بازار میں ہم سب ہر اک چیز خریدیں گے اب
پہلے آؤ چاول لے لیں پھر بیگن اور پلول لے لیں
تھوڑی باندھا گوبھی لے لیں ایک عدد پھول کوبھی لے لیں
دودھ دہی ، مٹھائی لے لیں برفی اور بالائی لے لیں
مرچ مسالہ بھی لینا ہے دال اور آٹا بھی لینا ہے
دادی ماں کے پان بھی لے لیں ماچس اور لوبان بھی لے لیں
پتی سستی والی لے لیں چائے کی کچھ پیالی لے لیں
آلو پیاز اور تیل بھی لے لیں جلدی جلدی پیسہ دے دیں
مچھلی گوشت خریدیں چل کر اور یہاں سے چلیں نکل کر

گھر پہنچیں گے جانے کب تک آگئے ہوں گے مہماں اب تک
مل جل کر سب لوگ پکائیں خود بھی کھائیں ، سب کو کھلائیں

مہماں رخصت جب ہو جائیں جاکر پھر ہم سب سو جائیں
کیونکہ صبح اسکول ہے جانا
نہیں چلے گا کوئی بہانہ

PDF Compressor Free Version

نکہت جہاں

Research Scholar (P.U.) Imli Tal, Danapur Cantt. Patna 801503

جن کی شادی

ہمارے ابو کسٹم آفیسر تھے، بہت نیک دل اور لوگوں کی بھلائی کے لئے ہمیشہ تیار رہتے، یہاں تک کہ جان و مال سے بھی مدد کرتے تھے۔

جب میں بہت چھوٹی تھی ابو نے ایک واقعہ کا ذکر کیا جو مجھے آج تک یاد ہے۔ ایک مرتبہ ابو کچھ ضروری کام سے پوسٹ آفس گئے، کاؤنٹر پر لوگ جمع تھے، ایک شخص جو دیکھنے میں نہایت شریف لگ رہا تھا، کاؤنٹر پر جانے کے فوراً بعد واپس آ گیا۔ وہ بہت پریشان تھا، پریشانی کے عالم میں اِدھر اُدھر آ جا رہا تھا۔

ابو اس کے قریب گئے اور پریشانی کا سبب پوچھا۔ پہلے تو وہ خاموش رہا، پھر بہت پوچھنے پر اس نے بتایا کہ:

''مجھے آج اور اسی وقت کسی کو روپے بھیجنا تھا، مگر جتنا بھیجنا تھا اس میں پچاس روپے کم ہیں۔ اگر میں گھر جا کر روپے لاتا ہوں تو کافی دیر ہو جائے گی، اسی وجہ سے میں کافی پریشان ہوں۔''

''پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں، یہ لیجئے پچاس روپے۔''

''مگر واپس کیسے کروں گا، آپ کو تو میں جانتا نہیں۔''

''واپس کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ اگر آپ کی جگہ میں ہوتا اور کوئی ضرورت پڑتی تو کیا آپ میری مدد نہیں کرتے۔'' اس بات پر پہلے تو وہ خاموش ہو گیا، پھر بولا:

''آپ نے میری مدد کی ہے تو میری بھی ایک التجا ہے۔ کل میری لڑکی کی شادی ہے، آپ برائے مہربانی میرے غریب خانہ تشریف لائیں تو دلی خوشی ہوگی۔''

وہ اپنے گھر کا پتہ بتا کر چلا گیا، ابو بھی اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔ دوسرے دن ابو دفتر چلے گئے۔ اچانک ان کو شادی میں جانے کا خیال آیا۔ سوچنے لگے، شادی میں جانا ٹھیک ہوگا یا نہیں، میں تو ٹھیک سے انہیں جانتا بھی نہیں ہوں، پھر بھی شادی میں جانے کے لئے راضی ہو گئے۔ کسی سے کچھ پوچھے بغیر، بتائے ہوئے راستے پر بڑھتے گئے۔ جب گھر کے قریب آئے تو شادی کی پوری تیاری چل رہی تھی، دیکھا کہ گھر کافی سجا ہوا ہے شادی کا ماحول اور کافی ہنگامہ ہے۔ سب لوگ شادی کی تیاری میں لگے ہوئے ہیں، کھانے کی خوشبو آ رہی ہے، اچانک ابو کو کسی بہت ضروری کام کے چلتے شادی میں شرکت کئے بنا ہی واپس لوٹنا پڑا۔

تیسرے دن ابو کو خیال آیا کہ کیوں نہ آج جا کر مبارک باد دے آؤں۔ یہ سوچ کر اس جگہ پہنچے۔ وہاں جا کر کافی حیرت ہوئی کہ کل جہاں شادی کا ہنگامہ تھا، شادی کی تیاری چل رہی تھی، لوگ آ جا رہے تھے۔ آج یہاں کوئی ہنگامہ نہیں ہے نہ کوئی گھر ہے، نہ کوئی مکان، خالی جگہ بالکل ویران ہے۔ دور دور تک کوئی نشان باقی نہیں ہے۔

آخر ماجرا کیا ہے؟ وہ سوچ ہی رہے تھے کہ ایک ضعیف آدمی اِدھر سے گزرا۔ ابو نے ان سے پوچھا کہ کل یہاں بہت دھوم دھام سے شادی کی تیاری چل رہی تھی اور آج یہاں ہر طرف ویرانی چھائی ہوئی ہے۔ اس آدمی نے بتایا کہ میں تو یہاں قریب بیس برسوں سے رہ رہا ہوں۔ یہاں تو صرف میدان ہی میدان رہا ہے۔ آپ کیسی بات کر رہے ہیں۔ آپ کو ضرور کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔

ابو واپس گھر آ گئے۔ رات میں کھانا کھا کر سو گئے۔ خواب میں اس شخص کو دیکھا جو پوسٹ آفس میں ملا تھا۔ وہ کہنے لگا:

''میں آپ کی طرح انسان نہیں بلکہ ایک جن ہوں۔ میں بھی اللہ کی مخلوق ہوں۔ کل میری لڑکی کی شادی تھی۔''

یہ کہہ کر غائب ہو گیا۔

PDF Compressor Free Version

اکادمی مجلس عاملہ کی اعلیٰ سطحی نشست: چند مناظر

وزیر اقلیتی فلاح حکومت بہار و کارگزار صدر اکادمی ڈاکٹر عبدالغفور گفتگو کرتے ہوئے
ساتھ میں نائب صدر اکادمی جناب سلطان اختر اور
پروفیسر اعجاز علی ارشد وائس چانسلر مولانا مظہر الحق عربی و فارسی یونیورسٹی و نائب صدر اکادمی

دائیں سے بائیں: سکریٹری اکادمی جناب مشتاق احمد نوری
نائب صدر اکادمی پروفیسر اعجاز علی ارشد وائس چانسلر مولانا مظہر الحق عربی و فارسی یونیورسٹی
وزیر اقلیتی فلاح حکومت بہار و کارگزار صدر اکادمی ڈاکٹر عبدالغفور
نائب صدر اکادمی جناب سلطان اختر

اردو لرننگ کورس: تقسیم اسناد کے مناظر

اردو لرننگ کورس: سکریٹری اکادمی جناب مشتاق احمد نوری کامیاب طلبا و طالبات کو سند سے نوازتے ہوئے

اردو لرننگ کورس کے کامیاب طلبا و طالبات حصول اسناد کے بعد، سکریٹری اکادمی جناب مشتاق احمد نوری کے ساتھ

PDF Compressor Free Version

ZABAN-O-ADAB

Monthly Journal of Bihar Urdu Academy

(Under The Department of Minority Welfare, Govt. Of Bihar)

Registered with Registrar, News Papers of India R.N. No.- 26469/75

SSPOST Regd. No.- PT- 58 upto- 31-12-2017

Volume : 37 **No. 10** **October 2016**

Bihar Urdu Academy, Urdu Bhawan, Ashok Rajpath, Patna - 800004

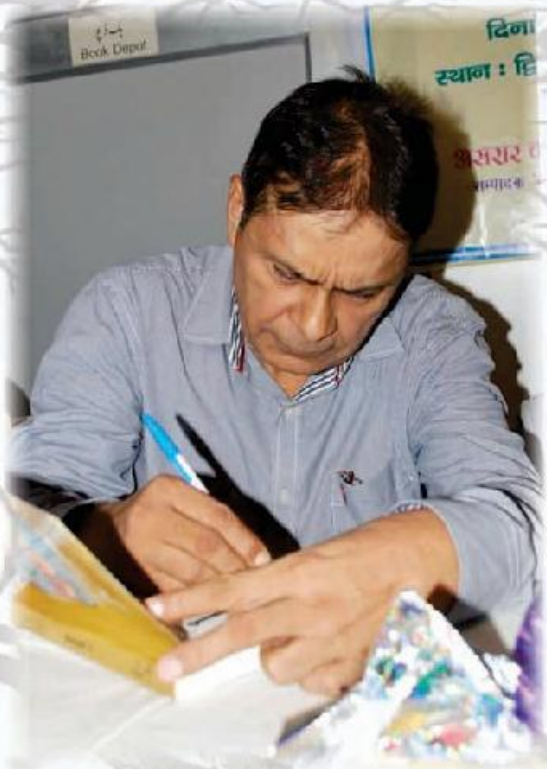

پیغام آفاقی تخلیقی موڈ میں

ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر مشتاق احمد نوری، سکریٹری بہار اردو اکادمی نے پاکیزہ آفسیٹ پریس، شاہ گنج، درگاہ روڈ، پٹنہ ۸۰۰۰۰۶ میں طبع کرا کے دفتر بہار اردو اکادمی، اردو بھون، اشوک راج پتھ، پٹنہ ۸۰۰۰۰۴ سے شائع کیا

Printed and published by *Moshtaque Ahmad Noori* Editor & Secretary Bihar Urdu Academy, on behalf of Bihar Urdu Academy, Urdu Bhawan, Patna-4 through Pakiza Offset Press Shahganj, Dargah Road, Patna - 800006